رنگ محل

(رومانی نظموں گیتوں اور غزلوں کا نیا مجموعہ)

از

ساغر نظامی

ناشر

ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار

جس کتاب پر
ناشر و مصنف کے قلمی دستخط نہوں گے وہ
مسروقہ سمجھی جائے گی

دستخط ناشر

دستخط مصنف

جون سنہ ۱۹۳۳ء

تعداد طبع (۱۰۰۰)

فہرست

غزل ۱۶۹

(باب سوئم) ۱۷۰

ذکیہ سلطانہ کے نام

مسز سروجنی نائیڈو

شاعری

شاعری زندگی کی طرح اپنی وسعت میں لامحدود ہے اور اپنے مقصد میں ہمہ تنوع، یہ وہ نادر آئینہ ہے جو حُسن کے ہر طرزِ جلوہ کا مظہر ہے۔ یہ وہ زرّین پیمانہ ہے جو حقیقت کی ہر نقطۂ نظر سے پیمائش کرتا ہے۔ یہ ہر انسانی جذبے سعی، مشاہدے ترک یا قبول کا ایک پُرکیف اور پائندہ نغمہ ہے، یہ ہر رسم و قید سے انسانی آزادی کی ایک شاندار پیشگوئی ہے اور دُنیا کے زخمی و مضطرب دِل کے لئے پیغامِ سکون و وعدۂ عافیت!

عرض حال

جنگ کے اس ہولناک اور ہیبت ناک زمانہ میں جب کہ موت آسان اور زندگی دشوار ہے۔ انسان ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ زمین اور آسمان کی بلائیں منھ پھاڑے ہوئے انسان کو نگل جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور جنگ جو ممالک ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ کہ درندگی اور خونریزی کی طرف سے نظر اٹھا کر انھیں حسن اور انسانیت کی طرف دیکھنے کا خیال بھی آنا دشوار نظر آتا ہے۔ ہم حضرت ساغر نظامی کی رومانی نظموں، غزلوں، اور گیتوں کا مجموعہ رنگ محل پیش کر رہے ہیں

رنگ محل جدید شاعری کے ان تمام تقاضوں کی حامل ہے۔ جو انسانی ذہن و روح کو نئی دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔ ساغر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی نظموں کی رومانیت داخلی ہی نہیں ایک خارجی ماحول بھی بناتی ہے۔ ان کے پس منظر میں زندگی کے آنسو بھی ہیں مسکراہٹیں بھی محبت کا جنون بھی ہے اس کی بے بنیادی بھی۔ ان میں سے کتنی نظمیں ایسی بھی ہیں جو رنگ محل سے نکل کر زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں میں دم لیتی ہیں۔

ساغر ساحل پر کھڑا ہوا موجوں کا تماشائی نہیں بلکہ کیفیات اور واردات کے طوفانوں میں تھپیڑے کھانے کا عادی ہے۔

جدید شاعر و مفکر کی حیثیت سے اردو شعر و ادب میں ساغر کی مسلمہ حیثیت کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں لیکن "رنگ محل" نے اس کے جوہر کو مخصوص طور پر نمایاں کر دیا ہے

میں جناب عبدالوہاب صاحب مسلم ضیائی ایم۔ اے کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ موصوف نے رنگ محل کی تصحیح میں مصنف اور ادارہ دونوں کی مدد کی۔

کاغذ کی کمیابی اور دیگر سامان طباعت کی نایابی کے اس دور میں ایسی دلکش اور دیدہ زیب کتاب چھاپنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ مگر مولوی سید عبدالرزاق صاحب اور مولوی سید عبدالوہاب صاحب مالکان اعظم اسٹیم پریس کی ہمت بلند نے میری مدد کی اور آج یہ خوبصورت تحفہ ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں

محمد اقبال سلیم گاہندری

دیباچہ

سنہ ۱۹۳۶ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۲ء تک کا تمام کلام اس مجموعہ میں نہیں، یہ چند نظمیں تین ابواب پر مشتمل ہیں۔ "رنگ محل" میں رومانی نظمیں۔ "دیپک" میں گیت۔ اور "غزال" میں غزلیں ترتیب دی گئی ہیں۔ ان ابواب میں جس قدر کلام ہے وہ زیادہ تر رومانی احساسات و تاثرات کو ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ رومانی احساسات و تاثرات اکثر نظموں میں اپنا مخصوص ماحول رکھتے ہیں، اس ماحول کے پس منظر میں زندگی کے تلخ حقائق، مشاہدات اور تجربات نے "رومانیت" کو ایک قطعی نیا روپ دیدیا ہے۔

یہ مجموعہ ٹھیک اس وقت شائع ہو رہا ہے جب شاعری کے متعلق مختلف ہنگامی زاویہ ہائے نگاہ کی دھوم ہے لیکن ان نظموں میں اسالیب اور اظہار و بیان کے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں میں انہیں کامل اعتقاد و یقین سے لکھتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ شاعری کو ہر پہلو سے ہماری داخلی و خارجی کیفیات کی زبان ہونا چاہیے جس قدر نادر و جدید اسالیب اور اظہار و بیان کے جتنے ترقی پسند مؤثر اور مفید ذرائع ہم پیدا کر سکتے ہیں کریں، لیکن افادیت یا "مقصدی" کے زعم میں شاعری کے جمالیاتی یا صناعتی معیار کو فنا کر دینا، آجتک کی تمام ارتقائی محنتوں پر پانی پھیر دینا ہے۔

پھر یوں بھی ہمارا زمانہ ایک عبوری دور ہے قطعی فیصلے ممکن نہیں کیا ہونا چاہیے کیا نہیں، مسلسل تبدیلی کے عہد میں کون ہے جو کسی ایک نقطہ پر قائم رہ سکے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہر وقت حقیقت رہے گی کہ شعر و ادب میں "ابدیّت" نہ ہوگی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہنگامی مسائل اپنے اندر کشش رکھتے ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ زندگی کا شاعر ان سے آنکھ بند نہیں کر سکتا لیکن شعر کو نثری خطبہ یا سیاسی تقریر بنا دینا ہرگز مسائل نگاری نہیں، مسائل حیات لکھنے کے لئے گہرے غور و فکر اور اعلیٰ صناعتی ذوق کی ضرورت ہے، جو آرٹسٹ ان عناصر سے روگردانی کرے گا وہ حکمت و شعر کو ملا کر ایک نیا مرکّب پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔

انسانی اعمال میں ارادہ اور اختیار کو دخل سہی، مگر ماحول میں حل ہو جانا پڑیگا

زندگی میں گھل جانے کی ضرورت ہوگی۔ ماحول کی کشمکش، اس نظام کے پست و بلند سماجی بندشوں، روح کے سیلاب اور جنسی و نفسی طوفان کی گرفت آسان کام نہیں، یہ صحیح ہے کہ زاویۂ نگاہ کا منفی یا مثبت ہونا شاعر کے فطری تقاضہ سے تعلّق رکھتا ہے لیکن زندگی کو آگے لیجانے اور دبے ہوئے حلقوں کو اُبھارنے کیلئے مثبت زاویۂ نگاہ لابدی ہے۔ "قدیم رومانیت" اور "جدید رومانیت" میں بظاہر فارم کی تبدیلی نظر آتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ قدیم رومانیت کی بُنیاد "داخلیت" پر تھی نئی رومانیت داخلیت کو جزوی طور پر قائم رکھتے ہوئے ایک خارجی ماحول بناتی ہے اسکے پس منظر میں زندگی کے آنسو بھی ہیں، مسکراہٹ بھی، محبّت کا جنون بھی ہے اس کی بے بُنیادی بھی۔

یہ چند نظمیں اسی قسم کی ہیں، بعض تو "رنگ محل" سے نکل کر زندگی کے تپتے ہوئے میدانوں میں جاکر دم لیتی ہیں بعض جھروکوں سے جھانک کر رہ جاتی ہیں اور یہ تکمیل و نا تمامی انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

گیتوں کی بُنیاد قدرتی اور نفسیاتی حقائق پر قائم ہے۔ اکثر میں قدیم ہندی شاعری کا تتبع کیا گیا ہے ان میں دبا دبا دُکھ ہے، پر یہ دُکھ یوں ہی نہیں، گنگناتے گنگناتے پڑھنے والے کے آنسو یہ بھید کہہ ہی دیتے ہیں، شاعر کی روح پر جو پہاڑ ٹوٹے تھے

کچھ ایسا ہی بوجھ میرے سینہ پر بھی ہے ۔

ان گیتوں کی زبان ہماری ملی جلی بولی کا اک نمونہ پیش کرتی ہے، اس نمونے سے بعض مخصوص اندازے ہوتے ہیں مثلاً اگر ہم پرانے اور نئے اجنبی عناصر سے بچکر عوامی ادب کی تخلیق آسان زبان میں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں ۔

صناعت وادب کی محسوس نشانیوں میں کلچر بھی اک نشانی ہے، پرانا ہو یا نیا میں اس کا قائل نہیں کہ جدت کے خبط میں اجنٹا کے غار اور تاج محل کو ڈھا دیا جائے۔ یہ سوچنے کا تو مجھے حق ہے کہ مدح و توصیف کے باوجود یہ عجوبہ کاریاں تیسرے درجہ میں پیدا ہونیوالے اعلیٰ ترین صناعوں اور مزدوروں کے معجزے ہیں، لیکن ان کی پسندیدگی ہرگز "رجعت" نہیں کہلا سکتی حقیقی آرٹسٹ کو تخلیق کے سلسلے میں جب بھی رنگ روغن اور سازو سامان کی ضرورت ہو اُسے حق حاصل ہے کہ وہ یہ تمام سامان اپنے ہی ماحول سے حاصل کرے۔ "رنگ محل" کے شاعر نے یہ سامان گنگا جمنا کے ساحلوں اور متھرا کے آس پاس کے گانوں سے حاصل کیا ہے اسی لئے ان گیتوں کا ماحول خالص ہندوستانی اور ہندی ہے ۔

فارسی شاعری میں ایرانیوں کے قبولِ اسلام کے بعد بھی زرتشتی علم الاصنام کے کردار اہرمن و یزداں پائے جاتے ہیں، ایرانی شعراء نے مسلمان ہونے کے بعد بھی

اپنے وطنی ''خدا و شیطان'' سے کوئی تعصب نہیں برتا۔ ہر چند یہ عاقلانہ بات نہیں کہ مٹے ہوئے توہمات کو بیدار کیا جائے، لیکن ضمنی ترصیع کیلئے اگر ضرورت ہی آپڑے تو ہندو علم الاصنام کے کرداروں کا تذکرہ میرے نزدیک غیر مستحسن نہیں، آفاقیت کے ساتھ ساتھ اس طرح شاعری میں اک اجتماعی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اور شاعر کروڑوں عوام کے ذہنوں سے قربت حاصل کر لیتا ہے، مگر اس سلسلے میں رجعتی عناصر سے بچنے کے لئے شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس مجموعہ میں ''غزال'' کے عنوان سے غزلوں کا بھی اک باب ہے، میں غزل کا زیادہ قائل نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کی کسی زبان کی شاعری میں غزل کی مثال ہو تو ہو نہیں، اسے مٹانے کی ضرورت نہیں، یہ خود تبدیل ہو رہی ہے، جاگیرداری سماج کے پرتو کبھی کے ہٹ گئے، فتادگی، ربودگی، تصنّع اور دوسرے منفعل عناصر کی جگہ غزل میں ایک مخصوص توانائی، شگفتگی اور جان پیدا ہو چلی ہے۔

غزل میں ابھی تک کسی نے تانیثی ضمیر کا استعمال نہیں کیا، شاید اس لئے کہ غزل کی انفعالیت اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی ''رنگ محل'' کی غزلوں میں اسے جائز رکھّا گیا ہے، اصل میں ''عورت'' ہی غزل کا موضوع ہے، حکمت سے غزل کو کیا تعلق!؟

مسائل بسیط ہیں، اور گنجائش کم، مگر ان سطور سے مراد صرف اس قدر ہے کہ اجمالی طور پر

مصنّف کا نقطۂ نگاہ ظاہر ہو جائے۔

اس کے بعد دوسری کتاب "سیلاب" شائع ہوگی۔ جس میں غیر رومانی نظمیں ہونگی لیکن ان کی نوعیّت بتانے کے سلسلے میں قومی، انقلابی اور وطنی کے الفاظ استعمال کرنا اک قسم کی بد ذوقی ہے۔ ان قیود اور لیبلوں نے سرسوتی (فنونِ لطیفہ کی دیوی) کے شفاف ماتھے کو چھپا دیا ہے، شاعر کی خلّاق شخصیّت دب کے رہ گئی ہے۔ کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ "رنگ محل" بھی دل نے چنا ہے اور "سیلاب" بھی دل سے پھوٹیگا۔ اگر کوئی ادب کے کارناموں کو نمایاں کرنا سیکھنا چاہے تو ادارۂ اشاعتِ اُردو دکن کے اراکین سے سیکھے جو آگ اور خون کے طوفانوں کی بھی پروا نہیں کرتے، زندگی کے چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہے مگر "رنگ محل" کے کلس چمک رہے ہیں۔

ساغرؔ

رنگ محل

رنگ محل

باب اوّل

شاعر اور محبوبہ

محبوبہ

وہ سوز کیوں نہیں وہ ساز کیوں نہیں شاعر
صدا میں شعلۂ اعجاز کیوں نہیں شاعر
نوا میں لرزشِ غمّاز کیوں نہیں شاعر
طلسم خیزیٔ آواز کیوں نہیں شاعر
جو لوٹتا تھا وہ انداز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر :-

دماغ و رُوح نے وہ بوجھ اُٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ
جہاں نے دل پہ وہ آرے چلائے ہیں کہ نہ پوچھ

پہاڑ مجھ پہ وہ غم نے گرائے ہیں کہ نہ پوچھ
مری نگاہ کو وہ زخم آئے ہیں کہ نہ پوچھ

حقیقتوں نے وہ منظر دکھائے ہیں کہ نہ پوچھ
وہ جام زہر نظر سے پلائے ہیں کہ نہ پوچھ

زبانِ گنگ کا نغمہ سُنا نہیں تو نے
تباہ دل کا ترانہ سُنا نہیں تو نے

نوا تو صرف تھی پردہ سُنا نہیں تو نے
صدا تو صرف تھی دھوکا سُنا نہیں تو نے

خموشیوں نے وہ بربط بجائے ہیں کہ نہ پوچھ
بغیر گائے بھی وہ گیت گائے ہیں کہ نہ پوچھ

محبوبہ :-

دلوں کو رس میں بہاتا تھا شعلۂ آواز
خرد کے ہوش اُڑاتا تھا شعلۂ آواز

جنونِ شوق بڑھاتا تھا شعلۂ آواز
گرے ہوؤں کو اُٹھاتا تھا شعلۂ آواز
وہ مست شعلۂ آواز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

وہ مست شعلۂ آواز کیوں نہیں مت پوچھ
نوائیں زمزمۂ ساز کیوں نہیں مت پوچھ
وہ شورِ مستیٔ آغاز کیوں نہیں مت پوچھ
صدا پہ اپنی مجھے ناز کیوں نہیں مت پوچھ
خموش کر گئیں مجھ کو حیات کی چیخیں
دبا رہی ہیں گلا کائنات کی چیخیں

یہاں ہے دولت و طاقت کی کارفرمائی
بنامِ علم جہالت کی کارفرمائی
قدم قدم پہ "سیاست" کی کارفرمائی
نہیں جہان میں حقیقت کی کارفرمائی
جو وجہ نور ہے وہ شمع انجمن میں نہیں
بہار جس پہ ہو رقصاں وہ گل چمن میں نہیں

محبوبہ:۔

عروسِ ماہ کے بربط کو تھرتھراتا تھا
ربابِ وقت کے تاروں کو کپکپاتا تھا
تمام عالمِ موجود جھوم جاتا تھا
نفس نفس میں جو سوارغنوں بجاتا تھا
لبِ گداز میں وہ ساز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

نہ سوز کا ہے وجود اور نہ ساز کی ہستی
شعاعِ زر سے منوّر ہے عالمِ ہستی
ہیں اعتبار و تخیّل سے عشرتیں سستی
سکون دے گی بھلا کیا یہ راگ کی بستی
ہیں جنّتیں بھی جہنّم نگاہِ مفلس میں
سُلگ رہا ہے یہ عالم نگاہِ مفلس میں

محبوبہ:۔

جو میری روح کے ایوان کو سجاتا تھا
جو میرے دل میں امیدوں کے گل کھلاتا تھا

جو میری حسِ تجسس کو چھیڑ جاتا تھا
قدم قدم پہ جو مجھ کو کنوئیں جھنکاتا تھا
تمہاری آنکھ میں وہ راز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

وہ راز، راز نہ تھا اک کھلی حقیقت تھا
فریبِ سادہ دلی، کمسنئ فطرت تھا
نقابِ بے خبری تھا، حجابِ غفلت تھا
جو بے خبر ہو کرن سے وہ موجِ نکہت تھا
مری نگاہ میں تھی خامکاریوں کی چمک   جنونِ دل کی جھلک بیقراریوں کی چمک

محبوبہ:۔

تمہارا حسن تھا پندارِ شاعرانہ کبھی
تمہاری جان تھا ذوقِ پیمبرانہ کبھی
غمِ جہاں کو سمجھتے تھے تم فسانہ کبھی
تمہارے پائے تخیل پہ تھا زمانہ کبھی
وہ دیوتاؤں کے انداز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:—

مرے شعور کو ذوقِ "انا" نہ تھا اس وقت

کہ امتیازِ خودی و خدا نہ تھا اس وقت

دماغ و عقل سے پردہ اُٹھا نہ تھا اس وقت

نفیرِ رُوح کا نغمہ سُنا نہ تھا اس وقت

وہ ایک کیفیتِ شوق تھی مگر ناقص

وہ اک انانیتِ ذوق تھی مگر ناقص

محبوبہ:

نظر نظر میں مجھے بے نقاب دیکھتے تھے

قدم قدم پہ امیدوں کے خواب دیکھتے تھے

نگاہِ شیب میں برقِ شباب دیکھتے تھے

کبھی تم آنچ میں موجِ شراب دیکھتے تھے

وہی طلسمِ نظر آج کیوں نہیں شاعر!؟

تمہارے دل پہ تحیّر کی کیوں حکومت ہے

تمہارے دل پہ تحسّر کی کیوں حکومت ہے

تمہارے دل پہ تفکّر کی کیوں حکومت ہے
تمہارے دل پہ تغیّر کی کیوں حکومت ہے
تمہارے دل پہ مراراج کیوں شاعر!؟

شاعر:-

یہ شہر، پاپ کے بازار اور یہ جنس لطیف
بسورتے ہوئے چہرے، یہ جسم ہائے نحیف
کوئی بنی ٹھنی بیٹھی ہے اور کوئی کثیف
رذیل جن کو سمجھتے ہیں عاشقانِ شریف
منافق و متکبّر سماج کی مخلوق
یہ فتنہ کار و دنی، سامراج کی مخلوق

یہ دوپہر، یہ کڑی دھوپ، اور یہ سنّاٹا
ہتھوڑی ہاتھ میں ہے اور اجیر دوشیزا
ہے ڈھیر چاروں طرف پتھروں کے ٹکڑوں کا
ہجوم خواب سے کھاتے ہیں ہاتھ جب جھونکا
نگاہ قہر، وہیں آنکھ کھول دیتی ہے
غریب، نیند میں موتی سے رول دیتی۔

یہ راہ راہ، یتیم، اور گلی گلی بیوا
یہ موڑ موڑ پہ بوڑھی بھکارنوں کی صدا
یہ بام بام جوانی و حُسن کا سودا
یہ ہر قدم پہ جنازہ وقارِ عورت کا
یہ دل گداز مناظر مٹا گئے مجھ کو
تمام رازِ محبّت بتا گئے مجھ کو

محبوبہ :۔

جو خود ہی شمع فروزاں تھی اور خود محفل
جو خود مسافرِ ہستی تھی اور خود منزل
جو خود تلاطمِ طوفاں تھی اور خود ساحل
جو زندگی کا خلاصہ تھی زیست کا حاصل
وہ شورشِ سحر و شام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

حیات، ماتمِ ماضی و حال ہی گزری
طلسمِ نشۂ ہجر و وصال ہی گزری

تصوّرات کے رنگین جال میں گزری
تمام عمر فریبِ خیال میں گزری
توہّمات کی ہر چیز پر حکومت تھی
نگاہِ قہر بھی پیغمبرِ محبّت تھی

محبوبہ:۔

چمن چمن تھی صبا کی نواگری زندہ
سمن سمن تھی تبسّم کی ساحری زندہ
جنونِ عشق تھا اور ذوقِ شاعری زندہ
جہاں میں جس سے تھی رسمِ پیمبری زندہ
نفس نفس میں وہ پیغام کیوں نہیں شاعر!

شاعر:۔

جو سازِ مخزنِ پیغام تھا وہ ٹوٹ گیا
جو بازِ مامنِ الہام تھا وہ ٹوٹ گیا
جو مستیوں سے بھرا جام تھا وہ ٹوٹ گیا
جو شیشۂ سحر و شام تھا وہ ٹوٹ گیا

لبِ کلیم میں اب ہمّتِ کلام کہاں
دلِ شکستہ میں گنجائشِ پیام کہاں

محبوبہ :-

شکستہ دل سے ہو، خاموش سے ہو، حیراں سے
حواس گم سے ہیں، ویراں سے ہو، پریشاں سے
کہ جیسے نطق کوئی چھین لے غزل خواں سے
بہار جیسے کوئی لوٹ لے گلستاں سے
جنونِ شوق کے انداز کیوں نہیں شاعر؟

شاعر :-

شکستہ دل ہوں کہ یہ بے حسوں کی محفل ہے
تحیّر آج غزل خوانیوں کا حاصل ہے
سکوت شوق کی طغیانیوں کا ساحل ہے
خموش یوں ہوں کہ منزل قریبِ منزل ہے

دبائے جاتی ہے سینہ حیات کی تلخی
کھرچ رہی ہے کلیجہ حیات کی تلخی

محبوبہ:-

مجھے تو یاد ہے وہ چاندنی میں اک محفل
زمیں بنی تھی فلک اور تم مہِ کامل
کہ جیسے کوئی پیمبر ہو عرش سے نازل
نظر نظر میں لئے سو صحیفۂ کامل
وہی مناظرِ اعجاز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:-

مجھے بھی یاد ہے وہ چاندنی وہ بزمِ جمال
غریقِ ساغرِ مے تھے تفکراتِ مآل
ہمارے پائے محبت پہ لوٹتا تھا کمال
مگر تمام فسانہ، تمام خواب و خیال
تری نگاہ کے پرتو سے دورِ ساغر تھا   نہ معجزہ تھا کوئی اور نہ میں پیمبر تھا

محبوبہ:-

جو عطر بیز تھا ہر لمحہ بوستانوں میں
جو خندہ بار تھا ہر وقت نوجوانوں میں

جو محوِ رقص تھا الفت کے آستانوں میں

جو سجدہ ریز تھا کل تک نگار خانوں میں

وہ آج بندۂ اصنام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

نہ میں اسیر ہوں بو کا، نہ بوستاں کا غلام

نہ میں ضعیف کا قیدی نہ میں جواں کا غلام

نہ کوئے یار کا درباں نہ آستاں کا غلام

نہ بُت پرست نہ میں عشوۂ بُتاں کا غلام

حرم کہاں کا اسیرِ کلیسیا بھی نہیں　　　　که آج میری خودی بندۂ خدا بھی نہیں

محبوبہ:۔

وہ میرا نام جو نطق و زبانِ شاعر تھا

وہ میرا نام جو سازِ جہانِ شاعر تھا

وہ میرا نام جو روحِ روانِ شاعر تھا

وہ میرا نام جو تسبیحِ جانِ شاعر تھا

وظیفۂ سحر و شام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

یہ دیکھ کر کہ گُل آزاد ہیں، کلی آزاد
نگاہ قیدِ تعیّن سے ہو گئی آزاد
نہیں ہے دامِ تنفّر سے آدمی آزاد
اگر نہیں ہے محبّت سے زندگی آزاد

شمیم محبس گلشن میں پا بہ جولاں ہے　　　مگر نسیم گلستاں سے تا بیاباں ہے

محبُوبہ:۔

ذرا تو یاد کرو سجدۂ وفا میرا
کہ سر جُھکا تو جُھکا دل بھی جُھک گیا میرا
کہاں گیا مرا شاعر وہ دیوتا میرا
خودی کے کیف میں سرشار وہ خدا میرا
وہ معبدِ سحر و شام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

نہ شورِ دینِ الٰہی ہے اور نہ اکبر ہے
نہ غزنوی ہے نہ وہ سومنات کا در ہے

نہ بتکدہ ہے نہ بت ہیں نہ ذوقِ آذر ہے

مآلِ گردشِ ساغر شکستِ ساغر ہے

وہ معبدِ سحر و شام پاش پاش ہوا

مرا شعور بھی اُس کو سجا نہیں سکتا

دلا نہ یاد، شکارِ سرور ہو جانا

وہ چوڑیوں کا تری چور چور ہو جانا

وہ ظلمتوں کا بھی اک موجِ نور ہو جانا

وہ تیرا سر کو اُٹھا کر غیور ہو جانا

وہ سجدہ، سجدہ نہ تھا تھی تڑپ جوانی کی

جنونِ شوق نے کی ابتدا کہانی کی

اُٹھی تو ایسے کہ جیسے تھکی ہوئی قمری

بڑھی تو ایسے کہ جیسے دبی ہوئی تتلی

چلی تو ایسے کہ جیسے ڈری ہوئی ہرنی

مگر شباب نے تجھ کو بنا دیا دیوی

تڑپ کے پائے منوّر پہ گر پڑی دنیا برنگِ اشک ترے در پہ گر پڑی دنیا

محبوبہ:-

وہ کیف و وجد، وہ ملہم سے رات بھر باتیں
پیام بر سے وہ مشلِ پیام بر باتیں
ستارہ شب تھیں کبھی نغمۂ سحر باتیں
وہ بے نیاز ترنّم وہ بے خبر باتیں
تمہیں وہ فرصتِ الہام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:-

وہ کیف و وجد، وہ ملہم، وہ رات بھر باتیں
فضا خموش، ستارے تھے چپ، مگر، باتیں
اثر کرینگی نہ مجھ پر یہ بے اثر باتیں
کہ پر فشاں ہیں تخیّل میں جوں شرر باتیں
وجود ہی میں منوّر ہے فکر کی قندیل
مری نواؤں کی مخلوق ہے درم جبریل

نشیمنِ سحر و شام میری فکر ہے اب
خود اک خزانۂ پیغام میری فکر ہے اب

خود ایک منبعِ الہام میری فکر ہے اب
خود اپنی فکر کا انعام میری فکر ہے اب
کلیمِ طور نہیں، پیکرِ رنگ و بو ہوں میں　　　　کہ اب حیات سے مصروفِ گفتگو ہوں میں

محبوبہ:۔

تبسّمات پہ اشکوں کا ہے گماں، ہے ہے
ترنّمات کو کہتے ہو تم فغاں، ہے ہے
ہر اک کرم ہے ہلاکت کی داستاں، ہے ہے
یہ پُختنہ کارِ تفکّر کی تلخیاں ہے ہے
تمہاری فکر فقط خام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

ہنسی کے شوق نے اکثر رُلا دیا ہے مجھے
کمالِ گریہ نے ہنسنا سکھا دیا ہے مجھے
مشاہدات نے ناقد بنا دیا ہے مجھے
کہ جمع و خرچِ مشیّت بتا دیا ہے مجھے
میں انقلاب سے خود کو بچا نہیں سکتا　　　　لگی ہے آگ جو دل میں بجھا نہیں سکتا

ستارہ رنگ یہ غنچے یہ مہ جبیں کلیاں
یہ شاخ شاخ پہ صبحیں یہ یاسمین کلیاں
یہ صحنِ باغ کی پریاں یہ نازنیں کلیاں
سحر کی گود میں کھلتی ہیں جو حسین کلیاں
شعاعِ مہر انہیں کیا مسل نہیں دیتی
نمو د بڑھ کے انہیں کیا کچل نہیں دیتی

محبوبہ :-

حجاب اُٹھ نہیں سکتے رُخِ مشیّت سے
اُلجھ رہے ہو عبث تم مزاجِ فطرت سے
یہ دل جو آج ہے باغی غمِ محبّت سے
یہ آنکھ جس کا تصادم ہے نظمِ قدرت سے
اسیرِ حلقۂ اوہام کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر :-

ہے میری روح کو بیعت غمِ محبّت سے
مری نگاہ تو کھیلی ہے حسنِ قدرت سے

حجاب کون اُٹھائے رُخِ مشیّت سے
اُلجھنے کی مجھے فرصت نہیں ہے فطرت سے
کہ خاکیوں کے مسائل بھی اک حقیقت ہیں یہ دُکھ وہ ہیں جو بلند از غمِ محبّت ہیں

محبوبہ :۔

جو چاہتا ہے زمانہ، وہ بات کہتے ہو
جدھر کو بہتا ہے دریا اُدھر ہی بہتے ہو
دبے دبے سے مصائب کو تم جو سہتے ہو
تھکے تھکے سے یہ چُپ چُپ سے تم جو رہتے ہو
عروجِ شوخیٔ انداز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر :۔

زبانِ عصر ہوں میں ترجمانِ عصر ہوں میں
سُنے کوئی تو عجب داستانِ عصر ہوں میں
شکستہ دل ہوں مگر نغمہ خوانِ عصر ہوں میں
ہے عصر سے مری ہستی نشانِ عصر ہوں میں
تمام جوہرِ ہستی لُٹا دیا میں نے مگر جہان کو جنّت بنا دیا میں نے

سرود و مستی و شوخی سے دور، دور ہوں میں
کہ جد و جہدِ مسلسل سے چور چور ہوں میں
شکستہ جام ہوں اُترا ہوا سرور ہوں میں
چراغِ صبح کی لرزاں سی موجِ نور ہوں میں
سحر کی گود میں بجھنا ہی میری فطرت ہے
جو ساری رات بھڑکتے ہیں یہ اُن کی قسمت ہے

محبوبہ:-

مدام سایہ فگن تھا جو نوجوانوں پہ
جو برق بن کے چمکتا تھا گلستانوں پہ
نقوش ثبت ہیں جس کے ابھی زمانوں پہ
ستارے جس سے سلگتے تھے آسمانوں پہ
وہ تند شعلۂ آواز کیوں نہیں شاعر

شاعر:-

مری نظر میں نہ تھی راگنی یہ آہوں کی
مری نظر میں نہ تھی ہوک چُپ نگاہوں کی

مری نظر میں نہ تھی بھیڑ داد خواہوں کی
مری نظر میں نہ تھی بھیڑ ویں گناہوں کی

ربابِ روح پہ احساسِ نو کا بار نہ تھا
میں گلفشاں تھا گلستاں میں شعلہ بار نہ تھا

حیات بے بس و تنہا مری نظر میں نہ تھی
نحیف آہِ شرر زا مری نظر میں نہ تھی
کراہتی ہوئی دنیا مری نظر میں نہ تھی
یہ پیر زال، یہ بیوہ مری نظر میں نہ تھی
سنے نہ تھے کبھی مزدور حسن کے نغمے
مرے خیال میں بھی فاقہ کش کے گیت نہ تھے

کہیں ہے بارشِ دولت، کہیں غموں کی اوس
یہ عشرتیں یہ مسرت، یہ قصرِ گردوں بوس
یہ جھونپڑوں میں کسانوں کی انتڑیوں کی مسوس

یہ ہے نظامِ جہاں میں خدا نہیں افسوس!
نہیں ستارے نہیں ریگ ہی کو بھڑکا دے
مری نوا سے امیروں کے دل ہی سلگا دے

محبوبہ :-

شرابِ شعر جو پی ہے تو ہوش ہی کیوں ہے
جو چور چور ہو پھر جذبۂ خودی کیوں ہے
خودی میں ڈوب کے احساس بے کسی کیوں ہے
خدا کی دین پہ اس درجہ برہمی کیوں ہے
عطائے حق پہ تمہیں ناز کیوں نہیں شاعر؟

شاعر :-

خدا کی دین کا اور زندگی کا ساتھ نہیں
جہاں میں زندگی و شاعری کا ساتھ نہیں
خلیل و بُت گری و آذری کا ساتھ نہیں
"سماج" اور بھلے آدمی کا ساتھ نہیں
کہاں کا ناز خدا سے مجھے شکایت -
کہ اس نظام میں شاعر کی کیا ضرورت

یہ آگ خون ، تباہی و ابتری کا نظام
خبیث جبر کے شانوں پہ قاہری کا نظام

یہ لوٹ مار کا جنگل، یہ خود سری کا نظام
یہ مول تول کی دُنیا یہ برتری کا نظام

یہاں میں پیش کروں روحِ شاعری، توبہ
کہ تُل رہی ہے جہاں جنسِ زندگی، توبہ

محبوبہ:۔

یہاں نہیں تو کہاں گیت گنگناؤ گے؟
ہمیں نہیں تو کسے دردِ دل سناؤ گے؟
کہیں بھید پہاڑوں میں جاکے گاؤ گے؟
جواہر اپنے درندوں میں کیا لٹاؤ گے؟
تمھیں حیات کا احساس کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر:۔

جواب میرے تحیّر کا کیا دیا تونے!
خود اپنے رخ سے حجاب اک اٹھا دیا تونے
جہانِ فکر و نظر کو ہلا دیا تونے
مرے شعور کو وحشی بنا دیا تونے

تو اس نظام کو سمجھی ہے برکتوں کا جہاں
اسی نظام کی تو بھی شکار ہے مری جاں!

محبوبہ:-

اسی نظام کی میں بھی شکار ہوں سچ مچ
عروجِ کیف نہیں ہوں خمار ہوں سچ مچ
چمن نہیں ہوں فریبِ بہار ہوں سچ مچ
فروغِ لالہ و گل کا غبار ہوں سچ مچ
مجھے حیات کے منظر دکھاؤ تو شاعر

شاعر:-

حریم شب سے گذر حجلۂ سحر سے گذر
جنون دید ہے تجھکو تو بحر و بر سے گذر
اُٹھا کے تیز قدم منزلِ سفر سے گذر
سفیر وقت کے مانند بام و در سے گذر
گھناؤنی ہے یہ بستی ابھی دکھاؤں تجھے
مجھے حیات کا احساس ہے بتاؤں تجھے

مشاہدات و مناظر سے کانپ جائیگی تو
رگوں میں سوکھ کے رہ جائیگا رقیق لہو
شمیم و گل کی قسم اے جہان رنگ و بُو
لبوں پہ چیخ ہی نکلے نہ آنکھ سے آنسو

ہر ایک منظرِ خوں ریز سے گذر جانا
پیامِ مرگ ہے اس راہ میں ٹھہر جانا

قدم قدم پہ ہیں مفلوج پا و دست نہ پوچھ
بلندیوں سے بھی ممکن نہیں ہے حسبت نہ پوچھ
یہ رقص گاہ یہ کمینے یہ ان کے مست نہ پوچھ
نظام دہر کے اے جاں! بلند و پست نہ پوچھ

سماج صرف لٹیروں کی اک جماعت ہے
یہاں تو جودتِ قزاق کی ضرورت ہے

سماج

کھِل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار   اے مری جانِ بہار

"خندہ" جز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں

"نغمہ" جز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں

ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بو ہے

گو وہیں موجِ تبسم کے فقط آنسو ہے

جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب

لالہ و گل کا تبسم ہے بہاروں کا فریب

کھِل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار   اے مری جانِ بہار

یہ چھپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن   اے مری جانِ سخن

جھوٹ سے مستیٔ گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ اساس
بحرِ تکذیب کے ٹھیرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں ابہام بنا دیتے ہیں

یہ چھپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن   اے مری جانِ سخن

ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات   اے مری کشتِ حیات

کبھی مجبور یہ ہو بارشِ الطاف امیر
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیّاد و اسیر
زہر خود شہد بنے، آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر

جذبۂ صبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو، محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحم ہو، محال
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشتِ حیات اے مری کشتِ حیات

ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر اے مرے حسنِ نظر
چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کے بت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بت
ان کے دل سنگ ہیں جاں سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر اے مرے حسنِ نظر

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روحِ گلاب اے مری روحِ گلاب
اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائے گی دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ و ہر ننگ

ہے یہی مرکزِ بو، اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جا نہ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے اڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روحِ گلاب   اے مری روحِ گلاب

گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال   اے مرے سازِ خیال
استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستوں چاہیے اس بیل کو زر دوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زرین کمرو گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں ہی پہ اس گلشن کا
فن ہو یا حسن جوانی ہو کہ پیغا مبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال   اے مرے سازِ خیال

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ جھک ابرِ نظر اے مرے ابرِ نظر

یوں تو شیریں ہیں بظاہر یہ مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہراب تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ تبسم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت غمّاز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ جھک ابرِ نظر اے مرے ابرِ نظر

مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا حسنِ نظر اے مرے حسنِ نظر

یہ کرم اور یہ اخلاق یہ مجرے یہ سلام
یہ تواضع یہ تکلف یہ تبسم یہ کلام
ہر نفس گدگدے صوفوں پہ قعود اور قیام
ہر ادا قاتل و صیاد نظر دانۂ دوام

پَر یہ سب ذوقِ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
اِن نمائش کے بتوں میں بخدا کچھ بھی نہیں
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا حسنِ نظر اے مرے حسنِ نظر

عشرت و ثروت و حکمت پہ نہ جا روحِ خرد اے مری روحِ خرد
کسی نسخے میں فقط شاہد و مینا و شراب
کسی نسخے میں فقط نغمہ و طاوس و رباب
کسی نسخے میں فقط دولت و زر سحرِ حلال
کسی نسخے میں فقط دین کی افیون کا زلال
یہی اجزاء و عناصر ہیں تو صحت معلوم
نوعِ انساں کی کھلے گی کبھی قسمت معلوم
عشرت و ثروت و حکمت پہ نہ جا روحِ خرد اے مری روحِ خرد

ہم تم

وہ دور یاد ہے جب بیقرار تھے ہم تم
بکارِ دل ہمہ تن انتظار تھے ہم تم

وہ وقت یاد ہے جب نغمہ بار تھے ہم تم
وہ عہد یاد ہے جب کامگار تھے ہم تم

وفا نصیب، محبّت شعار تھے ہم تم

قیودِ دوریٔ منزل کو توڑ توڑ گئی
جنوں کی سوئی ہوئی روح کو جھنجوڑ گئی

دلوں پہ نقشِ حیاتِ دوام چھوڑ گئی
جو پہلی بار ملی اور دلوں کو جوڑ گئی

اسی نگاہ کی اک یادگار تھے ہم تم

وہ وادیوں میں سفر اور وہ چاندنی راتیں
وہ گھاٹیوں میں شب و روز شوق کی باتیں

وہ آرزو کا مچلنا، وہ درد کی گھاتیں
بساطِ دل پہ مشیّت کو اَن گنت ماتیں

فتوحِ عشق کے سرمایہ دار تھے ہم تم

کلی کلی سمنستاں کو ناز تھا جس پہ　　روش روش پہ گلستاں کو ناز تھا جس پر
چمن کہاں کا بیاباں کو ناز تھا جس پہ　　جہاں ہیں روحِ بہاراں کو ناز تھا جس پر

نسیمِ گل کی قسم وہ بہار تھے ہم تم

جو میں تھا بلبلِ گلشن تو تم گلِ رنگیں　　جو میں تھا مہر تو تم تھیں فروغِ ماہِ مبیں
ہمارے پاؤں پہ جھکتی تھی ساعتوں کی جبیں　　جو میں تھا صبحِ منوّر تو، تم شبِ زرّیں

جہانِ عشق کے لیل و نہار تھے ہم تم

متاعِ طور کا معدن تھا عالمِ امکاں　　جمال و نور کا مخزن تھا عالمِ امکاں
ہمارے عکس سے گلشن تھا عالمِ امکاں　　ہمارے نور سے روشن تھا عالمِ امکاں

سپہرِ شوق کے برق و شرار تھے ہم تم

چمن میں ناظمِ جشنِ بہار ہوتا کون!؟　　شگوفہ بارِ سرِ شاخسار ہوتا کون!؟
جنونِ شوق کا سرمایہ دار ہوتا کون!؟　　جہانِ عشق کا پروردگار ہوتا کون!؟

جہانِ عشق کے پروردگار تھے ہم تم!؟

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی عاشقی بیعت!　　ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی ساحری بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی زندگی بیعت　　ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی شاعری بیعت

جہانِ شعر کے وہ شاہکار تھے ہم تم

شرارِ گُل نے چمن کو کیا تھا خاکستر! صبا نے خاک اُلٹ دی تھی جام و ساغر پر
حسد سے شمع تھی محفل میں آتشِ بکسر دلوں کا ذکر نہیں دل تو خاک تھے جل کر

کئی جگہ تو نگاہوں پہ بار تھے ہم تم

وہ سوز، عشق کی حکمت نے ہم کو بخشا تھا وہ سازِ حسن کی فطرت نے ہم کو بخشا تھا
وہ ذوق، ساقیٔ قدرت نے ہم کو بخشا تھا وہ ظرفِ کیفِ محبّت نے ہم کو بخشا تھا

کہ آنکھ بند تھی اور ہوشیار تھے ہم تم

سمن سمن تھا بلاوا، سحر سحر آغوش چمن چمن تھی تمنّا، شجر شجر آغوش
نفس نفس تھا تقاضا نظر نظر آغوش نہ تھا نشانِ زمان و مکاں مگر آغوش

قدم قدم پہ کبھی ہم کنار تھے ہم تم

ہمارے دم سے ندا تھی ہمارے دم سے ندیم ہمارے دم سے صدا تھی ہمارے دم سے کلیم
ہمارے دم سے گھٹا تھی ہمارے دم سے شمیم ہمارے دم سے سحر تھی ہمارے دم سے نسیم

کہ حاصلِ چمنِ روزگار تھے ہم تم

ہر ایک ذرّے سے کرتے تھے آسماں پیدا ہر اک غبار سے کرتے تھے کارواں پیدا
ہر ایک چپ سے ہماری تھے سو بیاں پیدا ہر اک نگاہ سے کرتے تھے داستاں پیدا

قدم قدم پہ فسانہ نگار تھے ہم تم

وفا کے نقش پہ قرباں تھی لالہ کاری بھی		وفورِ وجد سے رقصاں تھی کامگاری بھی
ہٹی ہوئی تھی تعلق پہ دوستداری بھی		اثر سے وجد میں تھی روحِ جاں نثاری بھی

کچھ ایک دوسرے پہ یوں نثار تھے ہم تم

تغیرات پہ گہرا سکون سا چھایا تھا		دلِ حیات پہ ہلکا سا سکوں سا چھایا تھا
یہ کائنات تھی سادا سکوں سا چھایا تھا		ہر ایک شے پہ کچھ ایسا سکوں سا چھایا تھا

کہ جیسے سارے جہاں کا قرار تھے ہم تم

قیامتیں تھیں بپا چرخ کی سیاست میں		ہمارے نام تھے سرنامۂ بغاوت میں
کھٹک رہے تھے بہت دن سے چشمِ فطرت میں		ہماری ذات تھی اک تیر قلبِ قدرت میں

ازل سے چشمِ مشیّت میں خار تھے ہم تم

میں اک مغنّیِ مفلس تباہ حال و خراب		تم اک حیات کی رانی، نگارِ حسن و شباب
میں ایک ساغرِ خالی تم ایک جامِ شراب		نظر کے سامنے پھیلا ہوا ہے دامِ سراب

یہ جان کر بھی تمنا شکار تھے ہم تم

وہ ایک ساعتِ عاجل، وہ بے ثبات گھڑی		وہ بے ثبات گھڑی اف وہ عشرتِ ابدی
وہ اک خمارِ گریزاں، وہ نشۂ راہی		وہ ایک کیفِ مسافر، وہ دوڑتی مستی

رواں دواں تھی مگر بادہ خوار تھے ہم تم

ہر ایک پردہ تھا مضرابِ سازِ اُلفت کا کمال دیکھئے اک نغمۂ محبّت کا
طلسم ٹوٹ گیا تھا حریمِ قدرت کا گلہ سا بیٹھ گیا تھا نفیرِ فطرت کا
چمن میں جھوم کے یوں نغمہ بار تھے ہم تم

وہ بھید ہے کہ کوئی اس کو پا نہیں سکتا وہ نغمہ ہے کہ کوئی کھل کے گا نہیں سکتا
میں دیکھ سکتا ہوں پردہ اُٹھا نہیں سکتا میں سوچتا ہوں مگر لب پہ لا نہیں سکتا
کہ کس جنونِ وفا کا شکار تھے ہم تم

اور آج آج محبت پہ بار ہیں ہم تم عروجِ کیفِ وفا کا خمار ہیں ہم تم
جو گل کو چھو نہ سکی وہ بہار ہیں ہم تم بکھر گیا ہو جو گندھ کر وہ ہار ہیں ہم تم
نظامِ جبر کے زندہ شکار ہیں ہم تم!

سفینہ بحر میں ہے، بحر ہے سفینے میں خلش ہے خودکشئ مستقل کی جینے میں
سماج محو ہے آدم کا خون پینے میں ہزار جذبۂ سنگین ہے دفن سینے میں
گناہِ شوق کے زندہ مزار ہیں ہم تم

نظامِ مذہب و اخلاق کی دنائت نے دماغ و عقل کی ناپختہ کار حکمت نے
شنیع و جابر و سفّاک آدمیّت نے بسا کے پھونک دیا جس کو جبرِ قدرت نے
جہانِ گل کی قسم وہ دیار ہیں ہم تم

سحر کو پھونک دیں اور رات کو جلا ڈالیں
صفت کو خاک کریں ذات کو جلا ڈالیں
جہاں کی مُردہ حکایات کو جلا ڈالیں
جو بس چلے تو روایات کو جلا ڈالیں
مگر فریبِ نمودِ شرار ہیں ہم تم !؟



وعدہ

یہ وعدہ شاعر نے کس سے کیا، کیوں کیا ——— !؟

سوال بنیادی سہی، مگر ظالمانہ بھی ہے، دفتر لکھے جائیں تب بھی جواب نہ ہو سکے، پرانے بزرگ شاعری کو کھلا ہوا جھوٹ سمجھتے تھے (جو باقی ہیں وہ اب بھی سمجھتے ہیں) ان بزرگوں کے لئے تو جواب آسان ہے، یعنی صرف شاعری! یعنی صرف جھوٹ!؟

لیکن نئی نسل نفسیاتی تقاضوں کے پیشِ نظر سوال و جواب کرنے کی خوگر ہے۔ وہ کیوں مطمئن ہو، پھر کہاں انسانی دل و دماغ کی لامحدود ترغیبات، کہاں محدود مفلس اور تنگ دل زندگی، کہاں روح کی پیاسی بھکارن، کہاں بخیل سماج کا رِستا ہوا احمق کا پیالہ!؟ کہاں انسانی فطرت کی پرواز، کہاں قیدِ زمان و مکان!؟

آرزو کی تکمیل ناممکن سہی، مگر تخلیق کو کون روکے، اسکے طلسم کو کون توڑے، ——— !؟ کسی شے کو ..... چاہے جانے کی عمر چند سال، چند ماہ، چند ہفتے اور چند دن ہی نہیں، صرف ایک لمحہ بھی ہو سکتی ہے ——— کیسی عجیب حقیقت ہے کہ ہوتی بھی ہے!؟

ہم آن کی آن میں اپنی حیاتِ آرزو کے زمان و مکان بنا اور ڈھا سکتے ہیں ———

کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ بنا اور ڈھا دیتے ہیں !!

کبھی کبھی تو کوئی تصویر یہ یک نگاہ، شوق کے سانچے میں آئیڈل بن کر ڈھل جاتی ہے۔

خیال ہی خیال میں مندر تعمیر ہوتا ہے، باتوں باتوں میں پوجا ہونے لگتی ہے ———

اور تصوّر ہی تصوّر میں اک مسلسل حیات کی متحرّک قندیل زندگی کے تمام نقوش و دائر کے ساتھ گردش کرتی نظر آتی ہے۔

وہ مدہوش لمحہ جس میں صرف جذبہ کا بلند مجسّمہ مسکراتا ہے، ساری دُنیا کھنڈر ہوجاتی ہے، آتا ہے اور سائیں سے گزر جاتا ہے ——— !

وہ ایک بے ہوش اور سماج سے غافل و معصوم نگاہ، مگر پیامی نگاہ جس میں اک، نظام نامۂ حیات، اک مکمّل اقدام، کی روح کار فرما ہوتی ہے، ایک لمحہ میں کائنات سی بناتی اور عدم میں دفن ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد انسانی روح و دل کی سطح پر دُھندلکے میں چند مقبرے اُبھرتے ہیں، اور پھر وہی جمود و تاریکی ۔

انسان سوائے مجاور بننے کے بن کیا سکا!؟ ذہنی و قلبی طور پر سینے میں دبے ہوئے قبرستان کا مجاور بنا اور زندگی میں اسلاف کی قبروں کا، قبروں سے وقت جاتو فرسودہ روایات کا "وعدہ"، اسی قسم کے ایک مدہوش لمحہ، ایک بے ہوش اور معصوم نگاہ کی واردات کی تخلیق ہے، مگر کوئی گھڑی بھر کے بعد ہی، وہ لمحہ، وہ دیود، وہ نگاہ، یعنی سب کچھ علم میں

دفن ہوگیا، ہاں مدفون، اور گزران حادثہ کی محبوس اور باقی یادگار صرف یہ نظم ہے جو شاید کچھ دنوں تک انسانی فطرت کی پرواز اور ساتھ ہی بے بال و پری پر روشنی ڈالتی رہے گی۔

ساغرؔ

نہ چھوٹ پھوٹ کے رو لوٹ آؤں گا اک دن
شرارِ عشق کو بجلی بناؤں گا اک دن
چراغِ جبرِ مشیّت بجھاؤں گا اک دن
جہانِ عہدِ وفا جگمگاؤں گا اک دن
مجاز کو بھی حقیقت بناؤں گا اِک دِن
کبھی میں آؤں گا کلیوں کی آبرو بنکر
حجابِ گل میں کبھی کاروانِ بو بنکر
چمن کی خاک سے پھوٹوں گا میں نمو بنکر
ترے شباب کی نوخیز آرزو بنکر
نسیم و نکہت و شبنم پہ چھاؤں گا اک دن

سکونِ شام میں امید و بیم بن کے کبھی
سکوتِ شب میں سحر کا ندیم بن کے کبھی
نمودِ صبح میں روحِ نسیم بن کے کبھی
گلوں سے پھوٹ پڑوں گا شمیم بن کے کبھی
ترے مشام کی جنّت بساؤں گا اک دن

عروسِ نور کی میں اوّلیں نظر بنکر
صبیح دختِ سحر کا پیامبر بنکر
ملیح روپ میں مشاما کے نغمہ گر بنکر
نقیبِ قصرِ افق، مطربِ سحر بنکر
تری بلند اٹاری پہ گاؤں گا اک دن

جگاؤں گا تجھے ہم رازِ خامشی بنکر
تمام رات محبّت کی زندگی بنکر
سجاؤں گا تری راتوں کو چاندنی بنکر
برس پڑوں گا ستاروں سے روشنی بنکر
جمال و نور کے دریا بہاؤں گا اک دن

عنانِ شوق کسی سمت موڑتی ہی نہیں
کسی سے رشتۂ جذبات جوڑتی ہی نہیں
تعلّقات کے بندھن کو توڑتی ہی نہیں
تری نظر مرے دامن کو چھوڑتی ہی نہیں
یہ ضد یہ جبر میں کیونکر نہ آؤں گا اک دِن
نہ دیکھ جابر و مجبور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ تشنۂ و مخمور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ اپنی طرح چور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ رشکِ صدٗ انگور انکھڑیوں سے مجھے
خود اپنے ہاتھ سے تجھ کو پلاؤں گا اک دن
ربابِ عشق ہے برسوں سے بے صدا ہر چند
ہے مدّتوں سے مرا ساز بے نوا ہر چند
بنا دیا ہے زمانے نے بے وفا ہر چند
میں آج قدرت و آدم سے ہوں خفا ہر چند
نہ سوچ تجھ سے بھی آنکھیں چراؤں گا اک دن

یہ کوہسار یہ چشمے یہ آبشارِ رواں
شگوفہ زار کا یہ عکس یہ بہارِ رواں
یہ موج موج سرِ آب جو دیارِ رواں
یہ شاخسارِ مقیم اور یہ شاخسارِ رواں
اسی ہجومِ بہاراں میں آؤں گا اک دن
انہیں حسین کناروں کے سایہ میں شب بھر
انہیں جمیل نظاروں کے سایہ میں شب بھر
انہیں جوان بہاروں کے سایہ میں شب بھر
انہیں بلند چناروں کے سایہ میں شب بھر
بہارِ جشنِ شگوفہ مناؤں گا اک دن
شعاعِ مہر جھجک کر نظر جھکا دے گی
بہار طرّۂ گلہائے تر جھکا دے گی
نسیم دوڑ کے تاجِ سحر جھکا دے گی
شگفتِ گل ترے قدموں پہ سر جھکا دے گی
کنول کی اوٹ سے یوں مسکراؤں گا اک دن

ترے قریب بہ ہر رنگ وطور آؤں گا
میں رات بن کے شبستاں میں بار پاؤں گا
میں خواب بن کے تری آنکھ میں سماؤں گا
لباسِ رنگ کے پردوں میں جگمگاؤں گا
ترے وجود کی خوشبو چراؤں گا اک دن

جو ترے لب میں ہے اس نطقِ بے زباں کی قسم
تری زباں میں جو ساکت ہے اُس بیاں کی قسم
تری نگاہ کی غمّاز داستاں کی قسم
جو تیری روح میں ہے اُس فسانہ خواں کی قسم
تمام رات کہانی سناؤں گا اک دن

میں بن کے سلسلۂ خواب ٹوٹ جاؤں گا
بہ شکل یاد ترے حافظہ پہ چھاؤں گا
خیال بن کے ترے دل کو گدگداؤں گا
ذرا سی دیر نہیں، صبح تک جگاؤں گا
ستارۂ سحری بن کے آؤں گا اک دِن

یہ شعلہ زارِ محبّت ہے یا جمالِ فریب
ہوا ہے دل سے کئی بار اتّصالِ فریب
جنونِ عشق کی دولت ہے یا وبالِ فریب
جنونِ عشق حقیقت ہے یا کمالِ فریب!؟
جنونِ عشق کو پھر آزماؤں گا اک دن

جبیں میں صبح لئے بازوؤں پہ رات لئے
نظر نظر میں غمِ عشق کا ثبات لئے
جلو میں اپنے کرم ہائے کائنات لئے
کبھی یہ دیکھتا ہوں تو ہے شش جہات لئے
کبھی یہ سوچتا ہوں کچھ نہ پاؤں گا اک دن

مدام بارِ محبت اُٹھا نہیں سکتا
وفا کا نغمہ جاوید گا نہیں سکتا
قریب و دور کا مدفن بنا نہیں سکتا
تجھے یہ ڈر ہے کہ میں جا کے آ نہیں سکتا!؟
مجھے یہ خوف ہے تجھ کو نہ پاؤں گا اک دن

اس ایک لمحۂ مدہوش کو غنیمت جان
اس ایک ساغرِ سر جوش کو غنیمت جان
اِس ایک حاصلِ خاموش کو غنیمت جان
اس ایک حلقۂ آغوش کو غنیمت جان
کہ اس کو خالی و ویراں بھی پاؤں گا اک دن

نہ پوچھ لالہ رخ و جنّتِ جمال نہ پوچھ
لرز نہ جائے کہیں عالمِ خیال نہ پوچھ
میں جا رہا ہوں جہاں اس جہاں کا حال نہ پوچھ
شروع 'بھوک' ہے اور بھوک ہی مآل نہ پوچھ
فسانۂ غمِ آدم سناؤں گا اک دن

وفا کی قدر نہیں عاشقی کی قدر نہیں
غموں کی قدر نہیں، سرخوشی کی قدر نہیں
یہ زندگی ہے جہاں زندگی کی قدر نہیں
خود آدمی کو یہاں آدمی کی قدر نہیں
جو سن سکے گی تو سب کچھ سناؤں گا اک دن

نشاطِ فرض ہے قلبی مسرّتوں سے بلند
غمِ زمانہ ہے الفت کی عشرتوں سے بلند
کثافتوں کا ہے رتبہ لطافتوں سے بلند
حقائق اور بھی ہیں ان حقیقتوں سے بلند
رخِ حیات سے پردہ اُٹھاؤں گا اک دن

شعلۂ تیز کو نکہت کچل نہیں سکتی
شمیم حجلۂ گُل سے نکل نہیں سکتی
نزاکتوں سے یہ گاڑی سنبھل نہیں سکتی
حیات صرف محبّت سے چل نہیں سکتی
عجیب راز ہے لیکن بتاؤں گا اک دن

نہ جھانک آہ، جھروکہ سے یوں دمِ رخصت
نہ دیکھ دور تلک کاروانِ صد عبرت
ابد تو صرف ہے ایک روزنِ درِ وحشت
یقین کر کہ بہ فیضانِ جذبۂ الفت
عدم میں لاکھ دریچے بناؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤنگا اک دن

داستاں

زر کار پلّوؤں کو اڑاتی چلی گئی
قندیلِ مہر و ماہ بجھاتی چلی گئی

نورِ جمال میں وہ نہاتی چلی گئی
طوفان حیرتوں کے اٹھاتی چلی گئی

مہندی ہتھیلیوں سے چھڑاتی چلی گئی
دیپک سے ہر قدم پہ جلاتی چلی گئی

گستاخیٔ نظر پہ لجاتی چلی گئی
بیباکیوں کا بار اٹھاتی چلی گئی

رک رک کے دل کے بھید بتاتی چلی گئی
مڑ مڑ کے داستاں سی سناتی چلی گئی

ملتے ہی آنکھ پردۂ دل گونجنے لگا
نظروں سے دل کا ساز بجاتی چلی گئی

ہر ہر روش پہ موجِ تبسّم تھی گُل فشاں
پھولوں کی کائنات لُٹاتی چلی گئی

ہر ہر قدم پہ قشقۂ رنگیں کے عکس سے
ذرّوں کو آفتاب بناتی چلی گئی

وہ نغمہ ریز گاتِ وہ گاتی ہوئی حیات
رگ رگ میں بنسری سی بجاتی چلی گئی

وہ راگنی جو زہرہ و پروین گا سکیں
اپنی کمر کے لوچ سے گاتی چلی گئی

وہ مدھ بھرے شباب کی چھاگل لیے ہوئے
رستوں کو بادہ خوار بناتی چلی گئی

اسکے ہی میکدے میں جو کھنچتا ہے ہر نفس
وہ بادۂ عجیب پلاتی چلی گئی

جوڑا گلوں کے بار سے کھلتا چلا گیا
دیوانگی کو عام بناتی چلی گئی

میری نظر کو طائرِ آزاد دیکھ کر
دوشِ ہوا پہ جال بچھاتی چلی گئی

ہر ہر نفس وہ بوئے جوانی کی مستیاں!
میرے جنوں کو ہوش میں لاتی چلی گئی

کیفِ فراہشی سے عبارت ہے زندگی
یہ راز ٹھوکروں سے بتاتی چلی گئی

سو تیر میرے دل پہ نگاہوں کے پھینک کر
اک تیر اپنے دل پہ بھی کھاتی چلی گئی

اتنی فرصت کہاں؟!

یہ ہنستی ہوئی رات، یہ مست دریا — یہ دریا، یہ انجم، یہ ساغر، یہ مینا
سُنو تو مگر اے مرے دل کی ملکہ! — نہیں جاوداں یہ سُنہری تماشا

روا بھی ہیں مدہوشیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

گلوں سے مہکتا سفینا بھی برحق — مے و ساغر و جام و مینا بھی برحق
پلاتا بھی برحق ہے، پینا بھی برحق — محبّت کی اک رات جینا بھی برحق

مگر میں نہیں شادماں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

یہ منظر سلگتے ہوئے بام و در کا　　کلیجہ دہلتا ہے برق و شرر کا
دھڑکتا ہے دل وسعتِ بحر و بر کا　　مجھے ہو تصوّر نسیمِ سحر کا!

جوانی ہو جنّت نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

وہ اُمڈے شراروں کے طوفان دیکھو　　وہ برسے جہنّم کے سامان دیکھو
سلگتی ہوئی نسلِ انسان دیکھو　　نہ روکو، نہ روکو، مری جان دیکھو

قیام اب ہے یکسر زیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

رہِ زندگی، پُر خطر ہے مسلسل　　کہ یہ عالمِ خیر و شر ہے مسلسل
بظاہر حدوں میں مگر ہے مسلسل　　مسافر مسلسل، سفر ہے مسلسل

نہ منزل نہ کوئی نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

تخیّل میں ہیں لاکھ مبہم ارادے　　مچلتے ہیں دل میں یہ تخیُل زادے
ہے اک جسمِ کمزور لاکھوں لبادے　　مسافر ہوں تنہا ہزاروں ہیں جادے

سجاؤں نیا کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اُٹھائے نقاب اپنے رُخ سے جوانی نمایاں ہوں خال و خطِ زندگانی
فسانہ محبّت کا دل کی کہانی ادا ہوں یہ قصّے جنوں کی زبانی

یہ دکھڑے ہوں کھل کر بیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

جو مردہ گویّوں کی گائی ہوئی ہے جو اک عمر کی گنگنائی ہوئی ہے
جو زہر و شکر میں بسائی ہوئی ہے جو گزرے ہوؤں کی سُنائی ہوئی ہے

سُنوں پھر وہی داستاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

چمکنا ہے مجھ کو اُبھرنا ہے مجھ کو سنورنا ہے مجھ کو نکھرنا ہے مجھ کو
حقیقی محبّت پہ مرنا ہے مجھ کو محبّت کو جاوید کرنا ہے مجھ کو

محبّت میں ہوں رائگاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

مبصّر ہوں میں فطرتِ زندگی کا　　میں نبّاض ہوں حکمتِ زندگی کا
مغنّی ہوں میں عشرتِ زندگی کا　　حدی خواں ہوں میں عظمتِ زندگی کا

خود اپنا ہوں نوحہ خواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

کبھی خود ہوں صیّاد اور خود ہوں گلشن　　کبھی خود ہوں بجلی، کبھی خود ہوں خرمن
چھڑاؤں علائق سے کس طرح دامن　　کہ میں خود ہی رہبر ہوں اور خود ہی رہزن

کبھی آپ ہوں کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

ہنسے میری بے رنگیوں پر زمانہ　　مجھے ناگوارا ہوا اپنا ترانہ
مری مستیاں ہوں بہ شکلِ فسانہ　　پلا کر مجھے وقت خود ہو روانہ

ابد تک رہوں سرگراں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اسی آشیاں کو بچانا ہے مجھ کو　　بچا کر گلستاں بنانا ہے مجھ کو
بنا کر یہ گلشن سجانا ہے مجھ کو　　سجا کر جہاں کو دکھانا ہے مجھ کو

بناؤں نیا آشیاں یہ تو سوچ
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچ



وفا

وفا مجھ سے ہو گی ــــــ نہیں مجھ سے ہو گی ــــــ وفا اس جہاں میں!؟

افق کی طرف تک رہی ہو ابھی تک
پریشان و حیراں کھڑی ہو ابھی تک
تم اشکوں کی یکسر لڑی ہو ابھی تک
مرا راستہ دیکھتی ہو ابھی تک

نگاہوں میں برق و شرارِ محبّت
سراپائے صد انتظارِ محبّت
گماں بھی نہیں ہے خطا مجھ سے ہو گی

وفا مجھ سے ہو گی؟ ــــــ نہیں مجھ سے ہو گی! ــــــ وفا اس جہاں میں!؟

(۲)

جہاں خیر و شر میں نہاں ہے مشیّت
جہاں خو و مناظر ہیں اذنِ بغاوت
جہاں گھات میں خود ہے صیّادِ فطرت
جہاں دام بر دوش بیٹھی ہے قدرت

وہاں مجھ سے عہدِ وفا چاہتی ہو!؟
یہ کیا کہہ رہی ہو یہ کیا چاہتی ہو!؟
تمنّا کی تکمیل کیا مجھ سے ہو گی
وفا مجھ سے ہو گی؟ ــــ نہیں مجھ سے ہو گی ــــ وفا اس جہاں میں!؟

(۳)

یہ پھولوں میں جگنو فلک پر ستارے
یہ دہکے ہوئے آرزو کے شرارے
یہ ہر کو بہارے، یہ ہر سو نگارے
یہ بہکی جوانی کے پیہم اشارے

گناہوں کے سیلاب ہستی کے طوفاں
یہ ہر اک نفس میں تباہی کے ارماں
بتاؤ برائے خُدا مجھ سے ہو گی
وفا مجھ سے ہو گی؟ ــــ نہیں مجھ سے ہو گی ــــ وفا اس جہاں میں!؟

(۴)

درختوں پہ یہ چاندنی کا مچلنا اندھیرے میں یہ روشنی کا مچلنا
خودی کی تڑپ، بیخودی کا مچلنا یہ ہر موڑ پر زندگی کا مچلنا
یہ گنگا کی گودی، یہ جمنا کے دھارے
ہجومِ حسیناں کنارے کنارے
نہ دیکھوں انہیں یہ خطا مجھ سے ہوگی!؟
وفا مجھ سے ہوگی!؟ ــــ نہیں مجھ سے ہوگی ــــ وفا اس جہاں میں!؟

(۵)

یہ ہر موڑ پر حُسن کی مسکراہٹ یہ ہر گام اک مستقل جگمگاہٹ
یہ ہر آن احساس کی کسمساہٹ نئی اک قیامت کے آنے کی آہٹ
تمہارے تصوّر پہ ہنستی ہوئی سی
محبّت پہ آوازہ کستی ہوئی سی
یہ فطرت کی توہین کیا مجھ سے ہوگی؟
وفا مجھ سے ہوگی!؟ ــــ نہیں مجھ سے ہوگی ــــ وفا اس جہاں میں!؟

(۶)

یہ گلشن، یہ بھونرے، یہ بھونرے یہ کلیاں
یہ کانٹوں کی مٹّھی ہیں مالن کا داماں
یہ ڈھلکا سا آنچل کھُلا سا گریباں
گجر دم ہو وا جیسے بابِ خمستاں

نفس در نفس یہ گلابی تقاضے
مری تشنگی اور شرابی تقاضے
یہ پینے کی عادت فنا مجھ سے ہوگی!؟
وفا مجھ سے ہوگی!؟ ـــ نہیں مجھ سے ہوگی ـــ وفا اس جہاں میں!؟

(۷)

یہ دُنیا، یہ دُنیا کی جہدِ مسلسل
یہ بپتا کا صحرا انتہا ہی کا جنگل
دل و جاں ہیں بے کیف اور دست و پا شل
یہ سر پر فلاکت کے گھنگھور بادل

یہ بھوکی محبّت یہ پیاسی جوانی
مٹا دے مجھے اے غمِ زندگانی
اس افلاس و غم میں بھلا مجھ سے ہوگی!؟
وفا مجھ سے ہوگی!؟ ـــ نہیں مجھ سے ہوگی ـــ وفا اس جہاں میں!؟

(۸)

جہاں اب بھی جاری ہے، بردہ فروشی　　بنامِ ترقّی، بہ طرزِ غلامی
جہاں مفلسوں کی محبت ہے، تُلتی　　بہ اندازۂ ذوقِ سرمایہ داری

یہ گونگی تمنّا، یہ ارمان بہرے
محبت پہ بیٹھے ہیں سکّون کے پہرے
محبّت کی قیمت ادا مجھ سے ہوگی!؟

وفا مجھ سے ہوگی!؟ نہیں مجھ سے ہوگی ـــ وفا اس جہاں میں!؟

(۹)

میں خود بھی تو ہوں نیکی و شر کی دُنیا　　معاصی کا گھر، وعظ و منبر کی دُنیا
تمنّا کا بُت خانہ آذر کی دُنیا　　مے و جام و مینا و ساغر کی دُنیا

بزرگوں کی بد یوں نے پالا ہے مجھ کو
تو نیکی کے سانچے میں ڈھالا ہے مجھ کو
یہ خِلقی صفت کیا جدا مجھ سے ہوگی!؟

وفا مجھ سے ہوگی!؟ نہیں مجھ سے ہوگی ـــ وفا اس جہاں میں!؟

(۱۰)

جہاں شمع روشن ہے بجھنے کی خاطر جہاں کے نواسی ہیں مٹنے میں ماہر
جہاں زندگی جبر ہے موت جابر جہاں بیوفائی ہے اک امر ظاہر
جہاں موت عہدِ وفا توڑتی ہے
محبّت کو بے آسرا چھوڑتی ہے
یہ سنگین حقیقت جُدا مجھ سے ہوگی!؟
وفا مجھ سے ہوگی!؟ —— نہیں مجھ سے ہوگی —— وفا اس جہاں میں!؟



آنکھیں

نسیم و نکہت و رنگ و شراب ہیں آنکھیں
شگفتگی ہیں کنول ہیں گلاب ہیں آنکھیں
جزیرہ ہائے مہ و آفتاب ہیں آنکھیں
پہیلیوں کی طلسمی کتاب ہیں آنکھیں
نظر اُٹھا کہ خود اپنا جواب ہیں آنکھیں

سجودِ صبح کے پاکیزہ تر اثر کی قسم
شبِ گنہ کی دھڑکتی ہوئی سحر کی قسم
کسی عفیف کی بہکی ہوئی نظر کی قسم
تمام عالمِ اسرارِ خیر و شر کی قسم
پیامِ کفر و گناہ و ثواب ہیں آنکھیں

مچل رہی ہیں کبھی مسکرا رہی ہیں کبھی
سنبھل رہی ہیں کبھی لڑکھڑا رہی ہیں کبھی
فریب کیف میں سب کچھ لٹا رہی ہیں کبھی
چھلک رہی ہیں کبھی اور پلا رہی ہیں کبھی
شراب ہیں کبھی جامِ شراب ہیں آنکھیں

تڑپ رہی ہے غمِ گفتگو کی بے تابی
جھلک رہی ہے خفی جستجو کی بے تابی
شگفتگی کو ہے پروازِ بو کی بے تابی
چھلک رہی ہے مئے آرزو کی بے تابی
لطیف دو قدحِ اضطراب ہیں آنکھیں

سلام ہوتے ہیں پیہم پیام آتے ہیں
کلام ہوتے ہیں باہم سلام آتے ہیں
ابد نشاط تمنا کے جام آتے ہیں
عجیب ان کو طریقِ کلام آتے ہیں
کہ چپ ہیں بزم میں اور کامیاب ہیں آنکھیں

تصدق انپہ ہیں شام و پگاہ کے بھونرے
طواف کے لئے بیکل ہیں آہ کے بھونرے
تڑپ رہے ہیں مری تشنہ چاہ کے بھونرے
بنے ہیں نغمۂ رقصاں نگاہ کے بھونرے
کنول کی شاخ ہو تم اور گلاب ہیں آنکھیں

دلوں میں سوئے ہوئے کارواں جگاتی ہیں
عجیب خواہشوں کی مثنوی سُناتی ہیں
سپردگی کے عجب راگ گنگناتی ہیں
بغیرِ ساز ہی، سازِ کرم بجاتی ہیں
نگاہِ شوق ہے مطرب، رباب ہیں آنکھیں

بیان پھر ہوں فسانے حسین آنکھوں سے
بلند پھر ہوں ترانے حسین آنکھوں سے
کچھ اور مست نشانے حسین آنکھوں سے
بدل گئے ہیں زمانے حسین آنکھوں سے
نویدِ شورشِ صد انقلاب ہیں آنکھیں

شاعر کا نغمہ

مرا نغمہ بنائے کائناتِ ابنِ آدم ہے
کہ آدم خود مرے نغمے کی تصویرِ مجسّم ہے
بہارِ جاودانِ زندگی میرا تبسّم ہے
ربابِ شادی و غم ہے
یہ موجودات کیا ہے میرے نغمے کا تلاطم ہے
تلاطم در تلاطم ہے
ہواؤں کا ترنّم بحر و بر کا شور سب کیا ہے
مرا اک نغمہ ہے جو سو اداسے کارفرما ہے
ہر اک شے میں تڑپتا ہے

تڑپتا ہے مگر سمراج کو تڑپا نہیں سکتا
جبینِ شہر یاری پر پسینہ آ نہیں سکتا

ازل اک گت بھری آوازِ پا ہے میرے نغمے کی ابد اک ناشنیدہ سی صدا ہے میرے نغمے کی
ادا ہے میرے نغمے کی

ہیولے میرے نغمے نے بنائے ہیں زمانوں کے کہ ٹکڑے ہیں زمانے میرے نغمے کے فسانوں کے
گیتوں کی داستانوں کے

جوانی کیا ہے اک نغمہ محبت کیا ہے اک نغمہ یہ قدرت کیا ہے اک نغمہ یہ فطرت کیا ہے اک نغمہ
مشیّت کیا ہے اک نغمہ

مشیّت ہی کے سنگیں دل کو یہ تڑپا نہیں سکتا
نظامِ جبر قدرت پر تسلّط پا نہیں سکتا

لبِ منصور بھی اک موجِ رنگیں میرے نغمے کی نگاہِ سرمدی پروازِ شیریں میرے نغمے کی
یہ تمکیں میرے نغمے کی

نوائے عشق کی آغوش کا پالا ہوا ہے یہ جنوں کے ہاتھ سے پی پی کے متوالا ہوا ہے یہ
گل و لالہ ہوا ہے یہ

مشیّت کا نفس ہے زندگانی کا تنفّس ہے دلِ گرمِ حیاتِ جاودانی کا تنفّس ہے

جوانی کا تنفّس ہے

مگر عہدِ جوانی ہی کے یہ کام آ نہیں سکتا
کسی کو میری آغوشِ وفا میں لا نہیں سکتا

مری صہبائے نغمہ بادۂ جاویدِ ساقی ہے
چھلک کر میرے لب سے ساغرِ ہستی میں باقی ہے
جو بادہ تھا وہ ساقی ہے

اُبھرتا ہے یہ اپنی روشنی میں حدِّ منزل سے
گزرتا ہے پیامِ شوق لیکر حُسن کے دل سے
کسی کی مست محفل سے

گلستانِ جوانی کا گُلِ تر ہے مرا نغمہ
پیامِ عشق کا رنگین دفتر ہے مرا نغمہ
پیمبر ہے مرا نغمہ

پیمبر ہو کے بھی مجھ کو خدا کہلا نہیں سکتا
کسی کو میرا پیغامِ وفا پہنچا نہیں سکتا

میں جب نغمات کا دامِ طلسم آگیں بچھاتا ہوں
کہاں کا صید خود صیاد کو بھی کھینچ لاتا ہوں
دو عالم کو پھنساتا ہوں

مرا نغمہ ہزاروں ہرنیوں کو صید کرتا ہے
جو مجھ کو قید کرتی ہیں یہ اُن کو قید کرتا ہے
نرالے کید کرتا ہے

مکاں نغمے کے پھندے میں مکیں نغمے کے پھندے میں
پھنسے ہیں سینکڑوں زہرہ جبیں نغمے کے پھندے میں
حسیں نغمے کے پھندے میں

مگر خستہ جبینوں پہ یہ قابو پا نہیں سکتا
شکن آلود ماتھوں پر پسینا آ نہیں سکتا

شگفتِ گل اشارہ ہے مرے لہجے کے پھولوں کا
نسیمِ صبح خندہ ہے مرے نغمے کے پھولوں کا
مرے جذبے کے پھولوں کا

صبوحی پی کے نغمے کو اگر جھپکی سی آتی ہے
تو گاگر چھین کر شبنم کی اوشا مُنہ دھلاتی ہے
ربابِ گل بجاتی ہے

مرے نغمے کی لہروں سے چمن بیدار ہوتے ہیں
نسیمِ گل کے نازک قافلے تیار ہوتے ہیں
چمن سرشار ہوتے ہیں

مگر یہ ہندیوں کے قلب کو گرما نہیں سکتا
جہانبانی کا پرچم روح میں لہرا نہیں سکتا

مرا نغمہ ہے جنّت یہ بہارِ گل تو دھوکا ہے
کہ میرے گنگنانے سے چمن پر رنگ آیا ہے
چمن یوں لہلہایا ہے

کبھی بلبل کی صورت میں مرا نغمہ چہکتا ہے
کبھی کوئل کے دل میں سوزِ غم بن کر دہکتا ہے

کبھی گُل میں مہکتا ہے

پپیہا اور کوئل میرے نغمے کی اُڑانیں ہیں — یہ سب آتش نفس شاعر مرے نغمے کی تانیں ہیں

یہ میری ہی زبانیں ہیں

مگر روئے چمن پر رنگ پھر بھی آ نہیں سکتا
ضمیرِ گل میں نارِ زندگی دہکا نہیں سکتا

مرے نغمے کے زیر و بم میں ہے دُنیائے موسیقی — مرے نغمے کی دیوانی ہے خود لیلائے موسیقی

وہی سلمائے موسیقی

حجابِ خاک میں انگڑائی لیتا ہے مرا نغمہ — شرارِ سنگ کے پردوں سے پیدا ہے مرا نغمہ

شرارہ ہے مرا نغمہ

مرا نغمہ بیانِ روح ہے ایوانِ ہستی میں — مرا نغمہ فغانِ روح ہے بستانِ ہستی میں

ہر اک میدانِ ہستی میں

جنوں میرا حدودِ آگہی میں آ نہیں سکتا
میں یہ نکتہ سمجھ سکتا ہوں پر سمجھا نہیں سکتا

فرشتے وجد کرتے ہیں تو آدم رقص کرتے ہیں — مرے نغموں کی تانوں پر دو عالم رقص کرتے ہیں

کے وجم رقص کرتے ہیں

مرے نغمے کی دُھن سے سینۂ فطرت دھڑکتا ہے
مری تانوں میں صبحِ زیست کا تارا جھمکتا ہے
دھڑکتا ہے پھڑکتا ہے

جو دوشِ وقت پر جوشِ تلوّن سے بکھرتے ہیں
وہ گیسوئے مشیّت میرے نغمے سے سنورتے ہیں
سنورتے ہیں نکھرتے ہیں

مگر یہ گیسوئے مزدور کے کام آ نہیں سکتا
کسی اُلجھی ہوئی تقدیر کو سُلجھا نہیں سکتا

رگ و پے میں جہاں کے نغمۂ پیہم کا افسوں ہے
کہ ضربِ شوق سے نقّارۂ ہستی میں دوں دوں ہے
نہ گردش ہے نہ گردوں ہے

مرے نغمے کی دُھن پر وقت پیہم گنگناتا ہے
مرے نغمے کے جادو سے زمانہ جھوم جاتا ہے
یہ عالم ڈگمگاتا ہے

جنوں زارِ بغاوت ہے گزشت اک میرے نغمے کی
تغیّر ہے صدائے بازگشت اک میرے نغمے کی
مرا نغمہ ہے طوفانی

مگر ذہنوں کو پھر بھی خواب سے چونکا نہیں سکتا
روایات و عقائد کے بتوں کو ڈھا نہیں سکتا

روشنی

اے الوہیت کے سرچشمہ کی اک موجِ لطیف
کون ہو سکتا ہے بزمِ نور میں تیرا حریف

کہکشاں کی نوجوانی، اے ثریا کے شباب
تیرے دم سے بج رہا ہے چاند تاروں کا رباب

مسکراہٹ ہے تری گہوارۂ شمس و قمر
گنگناہٹ سے تری ہوتی ہے تخلیقِ سحر

قلبِ تاریکی میں دوڑاتی ہے تو برق و شرر
فاتحانہ، بے دھڑک اشیا کا سینہ چیر کر

رنگ بنکر لالہ و گل میں شرر پیرا ہے تو
آنکھ کے پردوں میں چھپ چھپکر نظر پیرا ہے تو

تھی تری نکھری ہوئی تصویر گلزارِ خلیل
ہے کلیدِ بابِ تاریکی ترا اسمِ جمیل

ہیں ترے دریوزہ گر شام و سحر لعل و گہر
فرش پر تابندہ ذرّے چرخ پر شمس و قمر

ذہنِ انسانی میں شمعِ فکر کا پرتو ہے تو
قلبِ انسانی میں سوزِ جاودانِ آرزو

نور ریزِ صبح ہے تو نور بخشِ شام تو
نقطۂ آغاز ہے تو مرکزِ انجام تو

محوِ سرگوشی رہی شب بھر قمر کی گود میں
صبحدم انگڑائی لی تو نے سحر کی گود میں

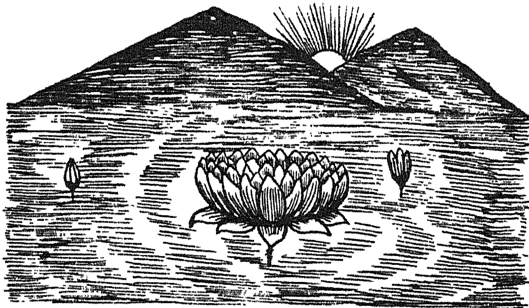
تیری ہر موجِ تبسّم ہے پیامِ زرنگار
تیری آمد ہے چمن میں آمدِ صبحِ بہار

سبزۂ گلشن کو اوجِ طور دیتی ہے کبھی
ادھ کھلی کلیوں کو غسلِ نور دیتی ہے کبھی

تیرے ہاتھوں میں ہے جادو ریز دامِ رنگ کا
تیرا رتھ ہے اور شعاعوں کی زمامِ زرنگار

تیری آمد ہے نویدِ انقلابِ زندگی
تیری آمد ہے پیامِ فتحِ بابِ زندگی

قطرۂ دریا کو عزمِ شورِ طوفانی بھی دے
ذرّۂ کاہیدہ کو ذوقِ درخشانی بھی دے



اوشا

تجھے معلوم ہے میں کس لئے مصروف ہوں اوشا!؟
مجھے دن رات مصروفِ عمل پاتی ہو اے اوشا
تو تم یہ دیکھ کر سکتے میں رہ جاتی ہو اے اوشا
کہ شاید میں تمہیں اس غم میں دل ہی سے بھلا بیٹھا
کسی کے مست و رنگیں گیسوؤں میں دل اُلجھا بیٹھا
مگر یہ جہدِ مضرابِ ربابِ کامیابی ہے

عمل دیباچۂ بابِ کتابِ کامیابی ہے
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگیں ہوں اوشا!؟

یہ تاروں کے کٹوروں میں شرابِ نور اے اوشا!
یہ پیپل کے درختوں پر شبابِ نور اے اوشا!
شبابِ نور سے ہر گام پر اک طور اے اوشا!
یہ سناٹا، یہ موسیقی قریب و دور اے اوشا!

مگر تو اس بہشتِ زندگی سے دور ہے اوشا
طلسمِ مذہب و اخلاق میں محصور ہے اوشا
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں اوشا!؟

تبسّم نے ترے تاجِ حیاتِ جاوداں بخشا
مری فانی محبّت کو ثباتِ جاوداں بخشا
زباں بخشی، بیاں بخشا، نظر بخشی، اثر بخشا
تڑپتی روح بخشی، اور قلبِ نغمہ گر بخشا

ذرا اٹھلا کے جمنا پہ خراماں ہو مری اوشا!
کنول کی پنکھڑی پر پھر تو رقصاں ہو مری اوشا!

تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں اوشا!؟

یہ تیرے کندنی ماتھے پہ رنگین چاند سا ٹیکا
جڑا ہو آئینہ میں جس طرح یاقوت کا ٹکڑا
وہ رنگین چوڑیوں کے گیت وہ باہوں کا دو تارا
وہ اندھیاری وہ دل کی دھڑکنیں وہ مست سنّاٹا

وہ ساون کی جھڑی وہ جھینگروں کے راگ اے اوشا
مرے سینے پہ لہراتے ہوئے دو ناگ اے اوشا

تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں اوشا!؟

مری چپ ایک گہرا راز ہے اسرارِ الفت کا
زباں سے کچھ نہیں کہتا، تو گویا کچھ نہیں کہتا
میں چپ ہوں اور چپ رہنا محبّت کی شرافت ہے
خموشی عشق کے معبد میں شاعر کی عبادت ہے

مری چپ بربطِ خاموشِ الفت ہے مری اوشا
یہ بربط عشق کی نازک امانت ہے مری اوشا

جو میں بولا تو ایوانِ مذاہب گونج اُٹھّے گا
لرز جائے گا کعبہ کانپ اُٹھے گی دیر کی دُنیا
چھڑے گا اک مہیب انداز سے ناقوس کا نغما
اُٹھے گا شور بحر و بر سے اک "اللہ اکبر" کا

مری یہ مستقل چُپ ایک گہرا راز ہے اوشا
خموشی میرے جذبوں کی دبی آواز ہے اوشا
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں اوشا!؟
یہ مذہب ہے جو دل کے ساغروں کو چور کرتا ہے
یہ مذہب ہے جو ہر نزدیک شے کو دور کرتا ہے
تجھے غمگین کرتا ہے، مجھے رنجور کرتا ہے
ہماری روح کو ہر گام پر مجبور کرتا ہے

مری صابر محبّت میرا مذہب ہے مری اوشا
یہی رنگین حقیقت میرا مذہب ہے مری اوشا

اگر بے صبر ہو جاؤں، اگر آزاد ہو جاؤں
تو قلعے مذہب و اخلاق کے اک آن میں ڈھاؤں

زمینوں کو ہلا دوں اور پھینکوں آسمانوں پر
اُٹھا لوں جوش میں ترلوک کو کمزور شانوں پر
مگر تیری وفا میرے جنوں کو روک دیتی ہے
جہاں میں ڈگمگاتا ہوں محبّت ٹوک دیتی ہے



تفسیرِ ماورا

مراحل، منازل، نشاں اور بھی ہیں
نشان و زمان و مکاں اور بھی ہیں

پسِ کارواں، کارواں اور بھی ہیں
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

پُراسرار و ذی روح ہیں یہ خلائیں
یہ انجم، یہ جگنو، یہ رقصاں ہوائیں

سمندر کو لے کر اٹھی ہیں گھٹائیں
"تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں

یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں"

نہ کر بندشیں جذبۂ آرزو پر — ہے فردوس قرباں تری گفتگو پر
نچھاور دو عالم تری آبرو پر — "قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں"

اگر چھوٹ گیا ان کا دامن تو کیا غم — اگر لٹ گیا تیرا گلشن تو کیا غم
اگر جل گیا دل کا خرمن تو کیا غم — "اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

سحر ہے دریچہ، قمر بام تیرا — ستاروں کی محفل میں ہے جام تیرا
ہے بکھرا ہوا ہر طرف دام تیرا — "تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں"

یہی روز و شب کچھ نہیں تیری دنیا — کہ یہ روز و شب ہیں فقط ایک سایا
زمان و مکاں روز و شب کی تمنّا — "اُسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں"

چھڑا نغمۂ جوش بزمِ وطن میں — چلا دورِ ساغر حریمِ سخن میں
ہوئے فاش اسرارِ گلشن چمن میں — "گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں"

بہار

پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے
بہار در بہار ہے، نگار در کنار ہے
شجر شجر ہے گل چکاں، کلی کلی ہے بوستاں   گلی گلی ہے زرفشاں، قدم قدم ہے گلستاں
روش روش نگار ہے
چمن چمن بہار ہے
فسوں بدوش ہر روش پہ مور کی پکار ہے

پلا شراب ساقیا کہ صبح نو بہار ہے
بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

۲

ورق ورق حریم گل، نفس نفس شمیم گل ، شمیم ہے ندیم گل، طیور ہیں کلیم گل
یہ ساعتِ صبوح ہے
دمِ نمازِ روح ہے
اذانِ کعبۂ چمن ترانۂ ھزار ہے
پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے
بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

(۳)

افق بساطِ طور ہے، طلوعِ رنگ و نور ہے، غم آج دل سے دور ہے، حکومتِ سرور ہے
لطیف و نرم اور حسیں
حسین و مست و نازنیں
دمک رہی ہے شیشہ گوں عروسِ صبح کی جبیں
پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے

بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

(۴)

کنارِ آبشار ہے، ہوائے جوئبار ہے، فضائے کوہسار ہے، بہشتِ لالہ زار ہے
نگار در کنار ہے
بہار ہی بہار ہے
نہ کہہ کہ جشنِ زندگی فریبِ اعتبار ہے
پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے
بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

(۵)

ادھر ہیں گُل، اُدھر ہیں گُل، بہارِ بام و در ہیں گُل، نشاطِ ہر نظر ہیں گُل، جمیل نغمہ گر ہیں گُل
بہشت بن گیا جہاں
زمیں سے تا بہ آسماں
خزاں کا ذکر آج کیا بیان نہ کر یہ داستاں
پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے
بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

(۶)

یہ طائرانِ خوش نوا، سوارِ مرکبِ ہوا، حسین اور دلربا، مغنّیانِ سحر زا

اکڑتا اور جھومتا

چمن میں ہو رآگیا

کہ آسمانِ باغ سے ستارہ ٹوٹ کر گرا

پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے

بہار در بہار ہے، نگار در کنار ہے

(۷)

وہ مالن آئی جھومتی، عذارِ گل کو چومتی ، وہ موہنی وہ کامنی، دوپٹّہ سر پہ جامنی

لبوں میں کرشن بنسری

مجسّم ایک بیخودی

نسیم بن کے باغ میں چلی بہار راگنی!

پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے

بہار در بہار ہے نگار در کنار ہے

عقیقِ ماہتاب دے، رفیقِ آفتاب دے، گلاب در شراب دے، شراب در گلاب دے

شراب دے، شراب دے

شباب دے، شباب دے

فسردہ کائنات کو نویدِ انقلاب دے

پلا شراب ساقیا کہ صبحِ نو بہار ہے

بہار در بہار ہے، نگار در کنار ہے



عورت

میں نے یہ مانا کہ تو ہے مادرِ نوعِ بشر!   ایک اک ذرّہ میں سو عالم بسا سکتی ہے تو
فطرتِ خلّاق کے جوہر دکھا سکتی ہے تو
گوتم اور عیسیٰ کو پھر دُنیا میں لا سکتی ہے تو
رنگ و نسل و قوم کے قلعوں کو ڈھا سکتی ہے تو
مشرق و مغرب کو اک کنبہ بنا سکتی ہے تو

آمنہ اور دیوکی نے جو پلایا تھا کبھی
پھر وہی ساغر زمانے کو پلا سکتی ہے تو

مریم و سیتا کی شیریں مسکراہٹ کی قسم
آج بھی سنسار کو جنّت بنا سکتی ہے تو

دشمنی کی آنکھ سے ٹپکے سرشکِ مادری
جنگ کے میدان میں یوں مسکرا سکتی ہے تو

پھول کو تبدیل کر سکتی ہے موجِ نار میں
موم کو اک آن میں آہن بنا سکتی ہے تو

لالہ و گل! لالہ و گل تو ہیں تیری گردِ راہ
مہر و مہ کو اپنے قدموں پر جھکا سکتی ہے تو

تیرے جلووں کی زمانہ تاب لا سکتا ہے کب
صرف پرتو سے جہاں کو جگمگا سکتی ہے تو

لوگ زندوں کو لئے پھرتے ہیں اے روحِ حیات
میں تو یہ کہتا ہوں مُردوں کو جِلا سکتی ہے تو

امن کے دیوتا سے لے سکتی ہے تو قاتل کا کام
ڈاکوؤں کو رحم کا حامل بنا سکتی ہے تو
موڑ سکتی ہیں تری نظریں کلائی موت کی
قم باذنی کہہ کے مُردوں کو جلا سکتی ہے تو
فتنۂ محشر کہ جس کی مدّتوں سے دھوم ہے
ایسے سو فتنے تبسّم سے جگا سکتی ہے تو
پھر اُلٹ سکتا ہے تیرا رنگ و بو کی کائنات
لہلہاتے باغ کو صحرا بنا سکتی ہے تو
مہر سے تیرے اُچھل پڑتی ہے سینوں میں حیات
آدمیّت کو سراپا دل بنا سکتی ہے تو
شورشِ صورِ قیامت ہے تری ترغیبِ جنگ
پتّھروں سے آبگینوں کو بھڑا سکتی ہے تو
زمزم و تسنیم و گنگا جس جگہ سیراب ہوں
آنسوؤں سے اپنے وہ سنگم بنا سکتی ہے تو

دہر میں حسنِ عقل کی بیداریوں کی دھوم ہے
اس کو تو صرف ایک لوری میں سُلا سکتی ہے تو

لیکن اے رازِ ازل اے چیستانِ زندگی!؟ بھید اب تک اپنا پایا ہے نہ پا سکتی ہے تو
بنتِ حوّا ابنِ آدم کو ذرا یہ تو بتا اپنے فطرت کے نہاں خانے میں جا سکتی ہے تو

تو نے خود ڈالی ہے اپنے رُخ پہ جو رنگیں نقاب
کیا اُسے بھی دستِ نازک سے اُٹھا سکتی ہے تو؟



پنگھٹ کی رانی

آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی
دُنیا ہے متوالی جس کی اور فطرت دیوانی
ماتھے پر سیندوری ٹیکا رنگیں اور نورانی
سورج ہے آکاش میں جس کی ضو سے پانی پانی
چھم چھم اُس کے بچھوے بولیں جیسے گائے پانی
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی
کانوں میں بیلے کے جُھمکے آنکھیں مے کے کٹورے
گورے رُخ پر تل ہیں یا ہیں پھاگن کے دو بھونرے
کومل کومل اسکی کلائی جیسے کمل کے ڈنٹھل

نورِ سحر مستی میں اُٹھائے جس کا بھیگا آنچل
فطرت کے میخانے کی وہ چلتی پھرتی بوتل
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

رگ رگ جس کی ہے اک باجہ اور نس نس زنجیر
کرشن مراری کی بنسی ہے یا ارجن کا تیر
سر سے پا تک شوخی کی وہ اک رنگین تصویر
پنگھٹ بیکل جس کی خاطر چنچل جمنا نیر
جس کا رستہ ٹک ٹک دیکھے سورج سارہ گیر
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

سر پر اک پیتل کی گاگر زہرہ کو شرمائے
شوقِ پابوسی میں جس سے پانی چھلکا جائے
پریم کا ساگر بوندیں بن کر جھومتا اُمڈا آئے
سر سے بر سے اور سینے کے درپن کو چمکائے
اس درپن کو جس سے جوانی جھانکے اور شرمائے
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

بادِ جنوب

ساحلِ راس کماری کی اک "موج" کے نام

وہ جانِ آرزو مرا مہمان ہے آج کل
فردوسِ حسن کلبۂ احزاں ہے آج کل

سرشارِ ذوق و جذبۂ عصیاں ہے آج کل
ایماں سے کفر دست و گریباں ہے آج کل

ہاتھوں میں ان کا دستِ گل افشاں ہے آجکل
مٹھی میں میری عالمِ امکاں ہے آج کل

بربطِ بغیر لمسِ ترنّم سے مست ہے
مطرب بغیرِ عزمِ غزل خواں ہے آج کل

داماں یار ہے مرے ہاتھوں میں اندنوں
اور دستِ یار میں مرا داماں ہے آج کل

ہر صبح ایک شامِ محبّت ہے اندنوں
ہر رات ایک صبحِ بہاراں ہے آج کل

سرشاریٔ شباب و محبت ہے اندنوں
جو شے ہے میرے سامنے رقصاں ہے آج کل

کوکب فشاں ہیں موجِ تبسّم کی سُرخیاں
ہر ذرّہ ایک شمع فروزاں ہے آج کل

وہ اپسرا ہے زینتِ فردوسِ آرزو
قدرت بھی جس کو دیکھ کے حیراں ہے آج کل

جس پر نثار کوکب و انجم کی کائنات
آغوش میں وہ روحِ شبستاں ہے آج کل

سامانِ دورِ ساغر و مے دوش پر لئے
گلشن میں ایک ابرِ خراماں ہے آج کل

رادھا کے روپ میں ہے کنہیا نظر فروز
جمنا بہ شکلِ کاکلِ پیچاں ہے آج کل

یہ مصحفِ ملیح، یہ لب ہائے نغمہ ریز
گیتا لبوں پہ آنکھ میں قرآں ہے آج کل

پائی تھی جس نے دل کے حجابوں میں پرورش
وہ راز اک حقیقتِ عریاں ہے آج کل

دل کا رقیب میں ہوں تو میرا رقیب دل
اللہ رے کیا کشاکشِ پنہاں ہے آج کل

سادہ مزاجِ عشق کا عالم تو دیکھئے
دل التفاتِ حسن پہ نازاں ہے آج کل

فردا کی بے کسی کے لئے کچھ تو بچ رہے
وہ جنسِ التفات کہ ارزاں ہے آج کل

معاہدات

سرِ شوق پیہم جھکاتا رہونگا
بہ ہر گام کعبہ بناتا رہونگا

یہ بادِ مخالف سے ہے شرط میری
چراغ اپنے خود ہی بجھاتا رہونگا

ہے برق و شرر سے مرا عہد نامہ
کہ خود اپنے خرمن بناتا رہونگا

شبِ تار سے میں نے وعدہ کیا ہے
اندھیرے کو مشعل دکھاتا رہونگا

زباں دی ہے خونخوار موجوں کو میں نے
کہ طوفاں میں بھی مسکراتا رہونگا

گزرتا رہیگا مرے سر سے طوفاں
میں موجوں کا بربط بجاتا رہونگا

کیا ہے تباہی سے یہ عہد میں نے
کہ تعمیرِ ہستی کو ڈھاتا رہونگا

یہ سازِ مشیّت سے پیماں ہے میرا
مصیبت میں بھی گنگناتا رہونگا

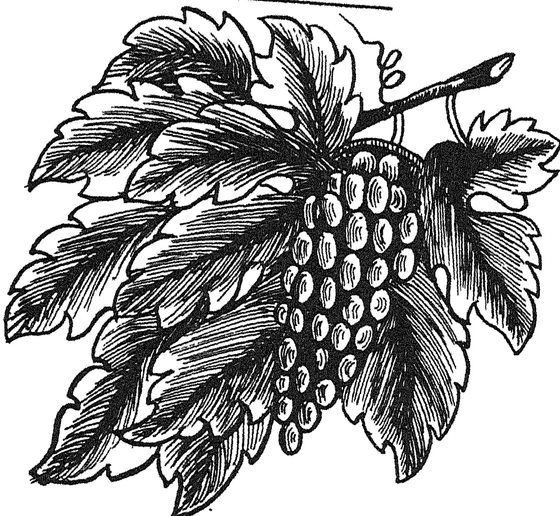
ہے تقدیرِ دامن کی صد چاک ہونا
میں دامن کو کب تک بچاتا رہونگا

حقیقت کے رخ سے، حقیقت کے رخ پر
حجابِ توہّم گراتا رہونگا

تغیّر کا جھنڈا نہ لہرائے جبتک
بغاوت کے پرچم اُڑاتا رہونگا

ہیں جنبش میں آویزۂ تاک جبتک
میں پیتا رہونگا پلاتا رہونگا

مرے دم میں دم ہے تو ساغر ابد تک
پلاتا، لنڈھاتا، بہاتا رہونگا



حسنِ گذراں

(سیرگاہِ لنولہ[1] کی ایک شام)

ہم ایک وجود کو دیکھتے ہیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو جاتا ہے۔ برق رفتارِ وقت ایک تصویر دکھاتا ہے، اور اس تصویر کو مہمل ابدیت میں گم کر دیتا ہے، حقیقت عام سہی، مگر کس قدر دقیق اور عجیب ہے، کتنے مناظر ہم نے ایسے دیکھے کہ اب ان کے دیکھنے کا کوئی امکان نہیں، گویا زندگی نام ہے حصول و ضیاع کی کشمکش اور اس کشمکش سے پیدا ہونیوالے حالات کے مستقل ماتم کا!؟

آئے وہ میرے پاس تو شرما کے چل دئے
آنچل کو کچھ سنبھال کے کترا کے چل دئے

ایمان و دین و ہوش کو تڑپا کے چل دئے
بھٹکے ہوؤں کو اور بھی بھٹکا کے چل دئے

---

[1] پونہ سے کچھ دور ایک پہاڑی سیرگاہ۔

مہکا ہوا وہ پیکرِ رنگین و پُر بہار
چمپا کے پھول راہ میں برسا کے چل دئے

آنکھیں وہ مست مست تبسّم وہ موج موج
ہر چیز پر شراب سی برسا کے چل دئے

وہ جلوۂ تبسّم رنگین نہ پوچھئے
ہر نقشِ رہگذار کو چمکا کے چل دئے

وہ جذبۂ ترنّم و مستی نہ پوچھئے
ہستی پہ اک شباب سا برسا کے چل دئے

بجلی سی ایک کوند گئی ہر نگاہ میں
ہنستے ہوئے وہ پاس سے اٹھلا کے چل دئے

وہ گرمیٔ جمال وہ حُسنِ نظارہ سوز
روح و دل و دماغ کو گرما کے چل دئے

وہ عہدِ ناتمام وہ پیمانِ ناتمام
اک کیفِ ناتمام سے للچا کے چل دئے

جو آگ روح و دل میں جہنّم فروز تھی
اس آگ کو وہ اور بھی بھڑکا کے چل دئے

ناگن تھے کوہسار کی یا برقِ نو بہار
آغوشِ ہر نگاہ سے بل کھا کے چل دئے

وہ نازکیٔ جلوہ، نگاہوں کا وہ ہجوم
بارِ نگاہِ شوق سے گھبرا کے چل دئے

ہر ذرّہ ایک مجمعِ چشم و نگاہ ہے
وہ خرمنِ حیات کو سلگا کے چل دئے

قصرِ امید، آہ وہ ایوانِ آرزو!!
تعمیرِ ہر خیال کو وہ ڈھا کے چل دئے

روکا گیا کسی سے نہ وہ کاروانِ ناز
ہر دل کی کائنات کو ٹھکرا کے چل دئے

آدرش[1]

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

وہ مرا خواب وہ ایوانِ تخیّل کی اساس
وہ مرا خواب، وہ تصویرِ خیال و احساس

جس کے قدموں پہ سرافراز تصوّر کی جبیں
جس کے شہپر مری پروازِ تخیّل کے امیں

جس کے انوار سے روشن ہے شبستانِ وجود
ورنہ اک صفحۂ سادہ تھا گلستانِ وجود

۱؎ آئیڈیل۔

وہ مرا خواب وہ ہستی کا شبستانِ جمیل
میرا سپنا، مرے مقصود کا ایوانِ جمیل

وہ مرا خواب وہ اک محشرِ انوارِ رواں
وہ مرا خواب وہ افسونِ تلاطم کا جہاں

میرا آغاز، مرا نشو، وہ میری تکمیل
میرے جینے کا سہارا، مرے مرنے کا کفیل

جس میں اک عربدہ جو رقص کناں ہے پیہم
مثلِ خوں میرے دل و جاں میں رواں ہے پیہم

تم نہیں ہو مرے سپنے کے شبستانوں میں
ہے کوئی اور مرے خواب کے ایوانوں میں

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو افسوس

نہ وہ قامت کہ جسے نشوِ تمنا کہئے
روحِ عظمت کا ابھرتا ہوا جذبا کہئے

سانپ کی طرح لچکتا ہوا پیکر بھی نہیں
بس اور امرت سے چھلکتا ہوا ساغر بھی نہیں

نہ وہ آنکھیں ہیں کہ تاباں ہوں جو اہر کی طرح
دل پہ زرریز رہیں دو ساغرِ گوہر کی طرح

نہ وہ ہاتھوں کا تناسب وہ بانہوں کا جمال
نہ وہ امواجِ تصور، نہ وہ گردابِ خیال

نہ وہ پھولوں کی مہک ہے، نہ وہ خوشبو کی لہک
نہ وہ پائل کی صدا ہے نہ وہ گھنگرو کی دھمک

کِھل کِھلاہٹ نہ وہ برگِ گلِ تر کا نغمہ
مسکراہٹ نہ وہ آثارِ سحر کا نغمہ

اس کا ہنسنا ہے نہ وہ سینۂ سیمیں کی ہے گونج
شورِ نغمہ ہے نہ وہ مطربِ رنگیں کی ہے گونج

نہ وہ بازو کہ جو بیتاب ہوں گردن کے لئے
لعل و گوہر سے لدے سانپ سے بل کھائے ہوئے

نہ وہ لچکی ہوئی شاخِ گلِ تر کا عالم
نہ وہ مچلی ہوئی ناگن سی کمر کا عالم

نہ وہ رفتار نہ ہر گام پہ رقصیدہ خرام
نہ قیامت کے وہ مجرے نہ وہ آفت کے سلام

گفتگو بارشِ القا، نہ خموشی الہام
نہ وہ چپ چاپ نظامِ ابدیت سے کلام

نہ ملامت نہ شکایت نہ لطافت نہ رضا
نہ تکلّم نہ تبسّم نہ ترنّم، نہ صدا

میری رگ رگ کو جکڑتی ہیں نگاہیں جسکی
باندھ لیتی ہیں مری زیست کو باہیں جس کی

مجھ میں محدود ہے پر روپ ہیں اسکے بیحد
کبھی معبود، کبھی عبد، کبھی خود معبد

جھانک کر میرے تخیّل سے مسلسل گانا
اور پھر میرے تخیّل ہی میں حل ہو جانا

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو افسوس

تم لرزتی ہو مرے جذبۂ صنعت گر سے
اس نے مقصود چرایا ہے دلِ آذر سے

تم بھڑکتی ہو مرے شعلۂ صنّاعی سے
اسکی فطرت کو ہے اک لاگ صنم سازی سے

نہ وہ عصیاں کی تڑپ ہے، نہ وہ ایماں کی جھلک
برسی پڑتی ہے نگاہوں سے رواجوں کی چمک

تم پہ ہر وقت روایات و عقائد کا عذاب
گرد ہے اسکی نگاہوں میں گنہ اور ثواب

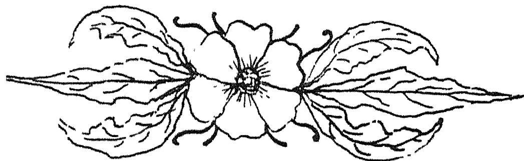
نہ وہ مٹنے کی تمنّا، نہ سنورنے کا جنوں
نہ ابھرنے کا سلیقہ، نہ بکھرنے کا جنوں

تمہیں پانی پہ بھی شک آتشِ سیّال کا ہے
زہر پر اس کو یقیں بادۂ کم سال کا ہے

اُسکے ابرو ہیں نگاہوں میں اداؤں میں مدام   ہیں اُبلتے ہوئے ساغر تو چھلکتے ہوئے جام
اُسکی آنکھوں کی سیاہی ہے جہانِ اشکال   لاکھ مبہم سے الم، لاکھ سسکتے سے خیال
ایک غمّاز خوشی اشک نما آنکھوں میں   لاکھ گردابِ وفا کھلتی ہوئی باہوں میں

یہ میری روح میں ہے قید بہ صد صبرِ تمام   اور تمہیں شوق کہ بن جائے مری روح غلام
تم سمجھتی ہو کہ افلاس میں رہتی نہیں لاج   اسکے نزدیک محبّت کی یہی ہے معراج
تمہیں قیمت کی طلب، اسکو محبّت کی طلب   تمہیں عشرت کی طلب، اسکو مصیبت کی طلب

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو افسوس



نئی موجِ طوفان

جگمگاتے ہوئے محلوں میں اندھیرا کر دیں
تیرہ و تار خرابوں میں اُجالا کر دیں
ہر تباہی و تصادم کو گوارا کر دیں
زلزلہ عالمِ محسوس میں پیدا کر دیں

اسی دُنیا کو اُلٹ کر نئی دُنیا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

یہ تضادوں کا جہاں، نفرت و اُلفت کا دیار
طنز کرتی ہوئی بے روح محبّت کا دیار
غم سے معمور خرابہ یہ مسرّت کا دیار
یہ روایات کا جنگل، یہ وراثت کا دیار
ہم جو چاہیں تو یہ سب کچھ تہ و بالا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

شکوے کب تک ہوں مشیّت کی تہی دستی کے
معجزے کیوں نہ دکھائیں خرد و مستی کے
کیوں نہ ہم خود ہی بسیّا ہوں نئی بستی کے
اپنے عکسوں سے نئے جال بُنیں ہستی کے
اور ہستی کو حریفِ غمِ دُنیا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

اے مری جانِ سرور، اے مری جانانِ سرور
حاصلِ ساغر و مینا و خمستانِ سرور
رحمتِ میکدہ اے سروِ خرامانِ سرور

گو نہیں میکدۂ زیست میں امکانِ سرور
پھر بھی اک عمر تو نذرِ مے و مینا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

وہ جو اک روح کی عشرت ہے متاعِ آخر
وہ جو اک جذبۂ وحشت ہے متاعِ آخر
وہ جو اک غم کی امانت ہے متاعِ آخر
وہ جو اک سوزِ محبّت ہے متاعِ آخر
مسکرا کر اُسے خورشیدِ تمنّا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

تیرے سپنوں کی مہکتی ہوئی خلدِ رقصاں
میرے خوابوں کے پُر اسرار کھنڈر مرثیہ خواں
یا ترے سینۂ موّاج کا بحرِ پنہاں
میرا ناپختہ تخیّل، ترا احساسِ جواں
جتنے پوشیدہ طلسمات ہیں پیدا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

چھنچھناتی ہوئی باہیں ہوں دھڑکتے ہوئے دل
لڑکھڑاتی ہوئی سانسیں ہوں بہکتے ہوئے دل
کپکپاتے ہوئے پیکر ہوں پھڑکتے ہوئے دل
عطر ملتے ہوئے سینے ہوں مہکتے ہوئے دل

اور یہ مل جل کے دو عالم تہ و بالا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

ہم سفر، راہنما، راہگزر ہو جائیں
سفرِ زیست کا خود زادِ سفر ہو جائیں
عشق کی شام، محبت کی سحر ہو جائیں
منتہا اپنے تجسّس کا اگر ہو جائیں

زندگانی کو بہر حال گوارا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

خود بھی سرشار ہوں، دُنیا کو بھی سرشار کریں
ہو سکے تو اسی ویرانے کو گلزار کریں
فاش اس قدرتِ فرسودہ کے اسرار کریں

موت کو دامِ محبّت میں گرفتار کریں
اور بقا کو ابدیّت کا اشارا کردیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کردیں

پرتوِ وقت ہے یا غنچۂ بشگفتہ کی بُو
موت کی گود میں مچلی ہوئی رفتارِ نمُو
یا کوئی بادۂ سرجوش سے لبریز سبُو
یہ جہانِ گزراں ہے کہ رمیدہ آہو
اس کو بھی کیوں نہ شکارِ غمِ فردا کردیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کردیں

عہد لیں زلزلوں سے آندھیوں سے ساز کریں
بحر کے قلب میں اک بابِ اثر باز کریں
آ کہ رقصاں ہوں، بپا محشرِ آواز کریں
عینِ طوفاں میں نئی زیست کا آغاز کریں
کشتی کو موج کریں، موج کو دریا کردیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کردیں

حسنِ الفت سے گذر جذبۂ نفرت سے گذر
خبطِ دولت سے گذر دامِ جلالت سے گذر
عشق کے نام پہ جذبوں کی تجارت سے گذر
سنگِ مدفن سے گذر تختِ حکومت سے گذر

زندگانی کو روایات سے بالا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

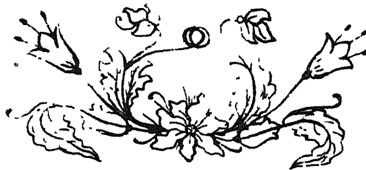
نقص اس کہنگیٔ فکر و عمل کے کبتک
تھرتھراتے ہوئے ذہنوں میں محلکے کبتک
ہم رہیں عزمِ گراں بار سے ہلکے کبتک
افقِ زیست پہ قسمت کے دُھندلکے کبتک

کوئی سورج اسی عالم سے ہویدا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

ہے توہّم رگ و پے میں وہی پیوست ابھی
آدمی نشۂ حکمت سے نہیں مست ابھی
فکرِ انسان کو بھرنی ہیں کئی جست ابھی

زندگی عشرت و آلام سے ہے پست ابھی
زیست کو عشرت و آلام سے بالا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

بے کس و بے بس و مظلوم سراپا کا علاج
غم سے کچلی ہوئی مسلی ہوئی بیوا کا علاج
نقص اور جبر کی مدقوق مریضا کا علاج
دین سے ہو نہ سکا علّتِ دُنیا کا علاج
آکہ دُنیا ہی کو دُنیا کا مداوا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں



بے نام تقاضہ

میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

عید کے روز امیدوں کا جہاں ہے روشن
یہ جہاں ہائے اندھیروں کا مکاں ہے روشن

جانے کس نور سے پنہاں و عیاں ہے روشن
آج کیوں میرا سیہ خانۂ جاں ہے روشن

مدّتوں سے یہ دیا میں نے جلایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

آئی بے روح مسرّات میں لپٹی ہوئی عید
لاکھ فرسودہ حجابات میں لپٹی ہوئی عید

زیرِ لب نغمہ چکاں رات میں لپٹی ہوئی عید
مسکراتی ہے روایات میں لپٹی ہوئی عید

دین کیا آج تو اندازۂ دنیا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی طوفان سا اٹھتا ہے مرے سینے میں　　کوئی رہ رہ کے مچلتا ہے مرے سینے میں
تند شعلہ سا بھڑکتا ہے مرے سینے میں　　ایک مبہم سا تقاضا ہے مرے سینے میں

اور یہ طوفان، محبت نے اٹھایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

زندگی مقتلِ آدم ہے، زمیں صاعقہ خو　　شہر یکسر ہیں اجاڑ، اور چمن بے خوشبو
ارتقا شام و سحر خون سے کرتا ہے وضو　　اسی عالم میں لنڈھاتا ہے کوئی جام و سبو

اور یہ ساقی کسی جانب نظر آتا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی کچھ نقش مرے ذہن میں ہیں مبہم سے　　بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں کسی عالم سے
یوں ہیں انجان ہوس اس جذبۂ بیش و کم سے　　جیسے مطرب سے رباب، اور زباں سرگم سے

یہ حقیقت بھی نہیں ہے، کوئی دھوکا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

اس طرح بنتے ہیں اک جال سا رومانِ شباب　　جیسے تخئیل کی اٹھتی ہوئی موجوں کے حباب

جیسے بہروپ سی بھرتی ہوئی لیلائے سراب   جس طرح تُرک کی ایران کے شبستانوں کے خواب
ہجر ان کا مری آنکھوں کو گوارا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

دل ہے پیچیدہ و ژولیدہ تصوّر کا شکار   روح ہے کشمکشِ جذبۂ پنہاں سے فگار
میرے نغمے ہیں کسی کور مغنّی کی پُکار   میری نظروں کے مقابل ہے جہانِ اسرار
لاکھ پردے ہیں، مگر نام کا پردا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

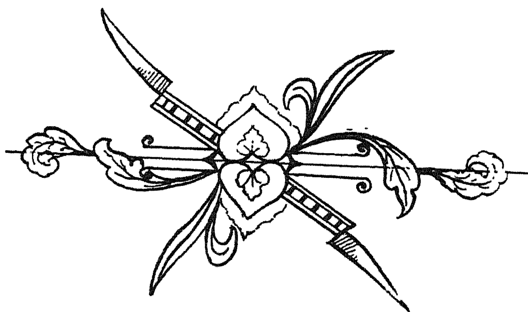
ساحروں کے سے عجب سحر جگاتا ہے کوئی   نشّے کے جال رگ و پے میں بچھاتا ہے کوئی
گر جو جاتا ہوں تنفّس سے اُٹھاتا ہے کوئی   میکدہ سارے دل میں لئے آتا ہے کوئی
اور ابھی تک مجھے اندازۂ صہبا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

میری فطرت ہے توہّم میرا جینا ابہام   واہموں کو میں سُناتا ہوں حقیقت کے کلام
ڈھالتا ہوں میں تصوّر میں ہزاروں اصنام   دل ہی دل میں تمہیں دیتا ہوں کسی شے کے پیام
سوچتا ہوں کہ یہ عالم کوئی سپنا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

ایک بپھرا ہوا طوفاں ہے حیاتِ آدم
آ کہ بپھرے ہوئے طوفان ہیں کودیں باہم

جس طرح دورِ زمانہ ہے مسافر ہر دم
میرا جذبہ بھی ہے بہتا ہوا اک موجۂ یم

جانتا ہوں کہ قرار اس کا تقاضہ بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں
پھر بھی یہ نذرِ محقر تمہیں منظور ہے کیا
دل کا چھلکا ہوا ساغر تمہیں منظور ہے کیا
جذبۂ وحشتِ یکسر تمہیں منظور ہے کیا
میرے نغموں کا گلِ تر تمہیں منظور ہے کیا
شوق کا تحفۂ احقر تمہیں منظور ہے کیا!؟



مکالمۂ ساقی و ساغر

درباب رحلتِ اقبال

ساغر:—

کیا ہوا رندِ بلا نوش تمام اے ساقی!
کیوں کھنکتے نہیں اب ساغر و جام اے ساقی؟
اشک آلود ہے کیوں نرگسِ مخمورِ سحر
خاک آلود ہیں کیوں گیسوئے شام اے ساقی؟

جیسے رہرو کسی کھوئی ہوئی شے کو ڈھونڈے
ہے کچھ ایسا ترا اندازِ خرام اے ساقی

نہ تو کلیوں میں تبسّم ہے نہ دریا میں خروش
کیا ہوا آج ترا ماہِ تمام اے ساقی

بادۂ جودتِ اقبال تھا خُم خانے میں
حاصلِ میکدہ و حاصلِ جام اے ساقی

مدفنِ شب ہے سحر مقبرۂ روز ہے شام
کیا یہی ہے تری دُنیا کا نظام اے ساقی

رہ گیا تھا وہی اک رندِ سبوکش باقی
نامۂ مرگ نہ آیا مرے نام اے ساقی

یہی انجام ہے گر میکشی و مستی کا
تیرے میخانے کو میرا بھی سلام اے ساقی

صبحِ محشر سے اِدھر کُھل نہ سکے گا شاید
اس طرح بند ہے دروازۂ عام اے ساقی

ہاں اُٹھا بزم سے اب ساغر و جام اے ساقی
کیا ہے عالم کی تباہی میں کلام اے ساقی
پُختہ ہے پُختہ ہے سرکارِ اجل کا دستور
خام ہے خام ہے قدرت کا نظام اے ساقی

جوابِ ساقی :-

جوشِ غم میں یہ ترا طرزِ کلام اے ساغر!
مرحبا لے یہ چھلکتا ہوا جام اے ساغر
مہدِ تخلیق ہو یا مرحلۂ مرگ و حیات
کہیں ہوتا ہے مسافر کا قیام اے ساغر
چشمِ مُردہ میں حیاتِ ابدی ہنستی ہے
مرگِ میخانہ تو ہے عمرِ دوام اے ساغر
نغمۂ قلقلِ مینا ہے فضا میں محفوظ
کہیں مرتے ہیں کلیم اور کلام اے ساغر
جس کی تخئیل تھی کل فرش پہ محوِ گل گشت
اب وہی عرش پہ ہے محوِ خرام اے ساغر

خاکِ اقبال کا ہر ذرّہ ہے میخانہ بدوش
خم بہ خم بادہ چکاں جام بجام اے ساغر
شعر اس کا ہے زمانے کو پیامِ ابدی
اس نے قائم کیا شاعر کا مقامِ ابدی
جام برکف ہے تری بزم کا ساقی اب بھی
جاوداں ہے مرے مستوں کا امام اے ساغر!

جواب الجواب :-

جسے کہتے ہیں ابد تیرے عوام اے ساقی
ہے وہ اقبال کی دردِ تہِ جام اے ساقی
لا صراحی و سبو و مے و جام اے ساقی
آج ڈھانا ہے مشیّت کا نظام اے ساقی
کیا کروں لیکے مئے مرگ کا جام اے ساقی
کہ مئے مرگ بھی ہے بادۂ خام اے ساقی
ڈھالتا جا مگر اتنا تو بتا دے مجھ کو
کن عناصر سے ہے ہستی کا قوام اے ساقی

گر پڑی آج کلیدِ درِ میخانہ کہیں
تیز تر ہے ترا اندازِ خرام اے ساقی
سقفِ میخانہ سے عالم میں منادی کر دے
غمِ اقبال میں پینا ہے حرام اے ساقی
تجھے معلوم نہیں اس کا مقام اے ساقی
دو جہاں کیف میں تھے اسکے غلام اے ساقی
بلبلِ وقت تھا اقبال کے نغموں کا شکار
طائرِ قدس ہے مرغِ تہِ دام اے ساقی

تین خواب

یہ نظم خود نوشت منظوم سوانحِ حیات کا ایک ٹکڑا ہے۔ ارادہ تھا کہ اس نظم کو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جاتا مگر زندگی کی کشمکش اور گوناگوں مصروفیتوں نے مجبور رکھا، پھر بھی ارادہ ابھی تک باقی ہے، جلد ہی اس کی تکمیل ہوگی، "رنگ محل" کے دوسرے ایڈیشن میں اس نظم کو مکمّل کر کے شائع کیا جائے گا، اور اگر یہ زیادہ طویل ہو گئی تو پھر اسے کتابی شکل دیدی جائے گی۔ بہرحال یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک طویل نظم کا ٹکڑا ہے اور دوسری آرزوؤں کی طرح ناتمام ہے۔

ساغر

تین خواب

ماضی (۱)

اے ماضیٔ معدوم مرے ماضیٔ معدوم
معدوم مگر اے مرے گہوارۂ معصوم

آحال کے ایوان میں اک آن کو دم لے
ڈر ہے کہ تری یاد بھی ہو جائے نہ موہوم

کیا یاد نہیں تجھ کو وہ ابوابِ فسانہ
جب لفظِ تمنا میں نہ تھے معنیٔ و مفہوم

مجبور سا مجبور، نہ آزاد نہ قیدی
آزاد سا آزاد، نہ مجبور نہ محکوم

ہر لفظ میں اک گیت تو ہر گیت میں اک گت
بے قید وہ اشعار نہ منثور نہ منظوم

چھوتے ہوئے جب مجھ کو لرزتی تھیں ہوائیں
کیا یاد ہے تجھ کو وہ مرا عالمِ معصوم

وہ عالمِ معصوم وہ فردوس کا سپنا
سرشار نہ بے کیف، نہ مسرور نہ مغموم

وہ رُخ پہ مرے کاکلِ زرّین و پریشاں
وہ لب پہ مرے موجۂ رنگینیٔ معصوم

وہ چشمِ سیہ مست، وہ جاوید شرابی
آنکھوں میں وہ ڈورے وہ مری مستیٔ مرقوم

وہ ابروئے خمدار کماں تانے ہوئے سے
وہ گیسوئے پُرپیچ یونہی بکھرے ہوئے سے

سرشار وہ بام و در و گلزار و بیاباں
گل چاک گریباں چمن آغوش بداماں

وہ رنگ جسے دیکھ کے کندن بھی ہو نادم
وہ نور کہ جھک جائے سرِ مہرِ درخشاں

مہکا ہوا وہ پیکرِ رنگین و معطّر
دہکا ہوا وہ قامتِ گلزار بداماں

بوٹا سا وہ قد آہ وہ شمعِ متحرّک
پرتو سے در و بام پہ ہوتا تھا چراغاں

ہنستی ہوئی بجلی وہ چمکتی ہوئی بجلی
گلشن میں دوالی کبھی صحرا میں چراغاں

وہ چمپئی رُخ اُس پہ پسینے کی وہ بوندیں
وہ صفحۂ شفّاف پہ ہیرے سے نمایاں

شبنم کا تبسّم تھا کہ پارے کے تھے ٹکڑے
پتّوں پہ کنول کے کبھی قائم کبھی لرزاں

ہونٹوں میں وہ گرتی ہوئی بجلی کا خزانہ
آنکھوں میں شبِ ماہ کا وہ موسمِ خنداں

ہر وقت وہ ہونٹوں میں ترنّم ہی ترنّم
ہا تو ہو چناروں میں کوئی جیسے غزل خواں

ہر وقت وہ چہرے پہ تبسّم ہی تبسّم
جیسے ہوں سمن زار میں جگنو شرر افشاں

گاتی ہوئی وہ مدھ بھری آنکھوں کی سیاہی
شاما ہو اٹاری پہ کوئی جیسے غزل خواں

معصوم وہ وارفتگیٔ حُسن کا عالم
دامن کا نہ کچھ ہوش نہ احساسِ گریباں

اللہ رے مری فطرتِ مجنون کا وہ بچپن
کانٹے کبھی دامن میں تو کانٹوں میں گریباں

آواز وہ آواز کہ ہر ساز سے آزاد
خود نغمہ و خود بربط و خود سازِ غزلخواں

وہ چال کہ دورِ مے و ساغر بھی خجل تھا
وہ حال کہ بدمست تھا میخانۂ امکاں

اک سلسلۂ لغزشِ مستانۂ پیہم
ہر گام پہ جنبش میں خمستاں ہی خمستاں

کیونکر ہو تصوّر مجھے نازک کمری کا
جھونکا تھا تخیّل میں نسیمِ سحری کا

سومنہ[1]

وہ سومنہ، اور سومنہ کی مست فضائیں
وہ کھیت، وہ میدان، وہ گھنگور گھٹائیں

"وہ باغ[2] میں انگریزی افواج کے ڈیرے
بندوق لئے جھیل کے اطراف میں پھیرے

---

[1] شاہ راہِ اعظم پر ضلع علی گڈھ کا ایک گاؤں۔

[2] جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ع) کے زمانے میں انگریزی فوج ہندوستان میں بہت کم رہ گئی تھی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۲ پر دیکھو)

وہ پیٹیاں، وہ وردیاں وہ پرچمِ جنگی
اُلجھی ہوئی ہر شاخ سے آوازِ فرنگی

وہ بدکے ہوئے بیل وہ سہما ہوا دہقاں
اور سایہ میں کیکر کے وہ اک طفلِ پریشاں

وہ خوف زدہ کھیت میں معصوم دُلاری
آنکھوں میں لرزتی ہوئی کاجل کی وہ دھاری

وہ پیچ وخمِ راہ میں رہگیر گریزاں
بدبخت غلامی کی وہ تقدیر گریزاں

وہ شاہرہِ عام پہ ٹھٹکے ہوئے عامی
چہروں پہ وہ تاریکیٔ ایقانِ غلامی

وہ جھیل پہ بندوق کے چلنے کا دھماکا
وہ چرخ سے مرغابیٔ مجروح کا گرنا

ہر آن وہ اک وسوسۂ قلبِ غلامی
ہر لمحہ مری روح پہ اک ضربِ غلامی

وہ شور اُٹھا گاؤں پہ آئی وہ تباہی
وہ آئے سپاہی ارے وہ آئے سپاہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) حکومت ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے اور اپنی فوجی طاقت کے مظاہرہ کے طور پر اس باقی فوج کو ہندوستان کے دیہاتوں میں گھما رہی تھی۔ سومنہ شاہراہِ اعظم اور ایسٹ انڈین ریلوے لائن کے بائیں کنارے پر ایک گاؤں ہے اور بائیں کنارے پر ایک چھوٹی سی آبادی "کٹرہ" کے نام سے۔ اسی کٹرہ کے ایک دیہاتی مکان میں میرا بچپن گزرا۔ سڑک کے کنارے میدان اور کٹرے کے باغ میں بھی فوجوں کا پڑاؤ ہوتا تھا۔ یہ بند اسی عہد و منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ فوجوں کو دیکھ کر جو دیرپا اثر میرے دل پر پڑا تھا اس اثر کو اس بند میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساغر

اس شور پہ گھر سے مرا گھبرا کے نکلنا — گودی سے بوا[1] جی کے وہ بَل کھا کے نکلنا
وہ قلبِ عساکر میں مرا جان کے جانا — خال و خطِ آفات کو پہچان کے جانا
اللہ رے مرے جذبۂ آزاد کی طفلی — چینی کے کھلونے نظر آتے تھے فرنگی

بے باک تھا کس درجہ مرا ذوقِ تماشا
جنگل تھا مجھے آئینۂ شوقِ تماشا ــــــ!

وہ سومنہ اور سومنہ کی مست فضائیں — وہ کھیت وہ میدان، وہ سرشار گھٹائیں
وہ مور کی چیخ اور وہ گھنگھور گھٹائیں — وہ معبدِ فطرت کے پجاری کی صدائیں
جھاڑی میں وہ شاما کے ترنّم کا تلاطم — رقّاصۂ فطرت کے وہ گھنگرو کی صدائیں
کوئل کی وہ کوک اور پپیہے کی وہ پی ہو — اک جانِ حزیں اُس پہ بلاؤں پہ بلائیں
وہ جھونپڑوں سے پھونس کے چکّی کا ترنّم — جھیلوں کے کنارے وہ ٹٹیری کی نوائیں
بیلوں کے وہ غول اور وہ بجتی ہوئی گھنٹی — کاندھوں پہ وہ ہل اور وہ کسانوں کی صدائیں
ٹھہرے ہوئے پانی میں وہ چڑیوں کا نہانا — چھائے ہوئے کھرے میں وہ ٹھٹری ہوئی گائیں
وہ مسکن چمپا[2]، وہ مرا مامنِ طفلی — ڈھلتی تھیں جہانِ حسن و محبت کی دائیں

---

[1] والدۂ محترمہ صغرا بیگم   [2] ہم سایہ لڑکی

وہ کھیر میں چمّا[1] کے کبھی آنکھ مچولی
چمپا کے مکان پر وہ کبھی پریم سبھائیں

وہ چاروں طرف کنواریوں کا مجمعِ رنگیں
دوشیزہ جوانی، کبھی دائیں کبھی بائیں

چوٹی پہ سرس کے جو یہ تارے سے ہیں روشن
یہ پھول بھی مل جائیں تو اک ہار بنائیں

وہ ہار جو دُنیا میں نہ گوندھا ہو کسی نے
وہ ہار جو گندھ جائے تو پھر تم پہ چڑھائیں

وہ کھینچ کے ہاتھوں کو مرے ناچنا اُس کا
لینا وہ ہر اک دور میں نظروں سے بلائیں

سایہ میں سرس کے وہ مرا جلسۂ طفلی
کم سن سا وہ ماحول وہ کم گو سی فضائیں

پھر شام کے پردے سے وہ تاروں کی گزارش
گر ہم کو اجازت ہو تو ہم بھی چلے آئیں؟

پھر چاند سے رہ رہ کے شعاعوں کی سفارش
اس نسل کو ہم نور کی دُنیا میں بسائیں

اس عمر کے انسان کو کریں دائم و قائم
اس عمر کے آدم کو خدا اپنا بنائیں

وہ چاند وہ گلبارِ سرس اور وہ ستارے
وہ ریت میں معصوم محبّت کے طرارے

---

[1] گاؤں کا ایک ہم جماعت پڑوسی لڑکا۔

عید کی رات

عید کی رات ہے عالم میں چراغاں کر دیں
آ کہ دُنیائے روایات کو قرباں کر دیں

ندّیاں خوں کی بہانا تو ہے اک رسمِ کہن
دیوتاؤں کو جگانا تو ہے اک رسمِ کہن
نقشِ ہستی کو مٹانا تو ہے اک رسمِ کہن
جوئے خون کاٹ کے لانا تو ہے اک رسمِ کہن

آ کہ دُنیائے روایات کو قرباں کر دیں

یہ روایاتِ کہن سال، یہ فرسودہ مزاج
کپکپاتے ہوئے قانون، یہ لرزندہ سماج
نہ یہاں خار کی عظمت، نہ یہاں پھول کی لاج
زندگی کے لئے اک موت ہیں یہ رسم و رواج
ان درندوں کو نہ کیوں زیست پہ قرباں کر دیں

گو ترے عشوۂ رنگیں کو نہیں ذوقِ نمود
گو تری فطرتِ غمگیں کو نہیں ذوقِ نمود
گو ترے جذبۂ تمکیں کو نہیں ذوقِ نمود
گو ترے بازوئے سیمیں کو نہیں ذوقِ نمود
پھر بھی فطرت کے ہر اک راز کو عریاں کر دیں

کاروانِ زیست کا جاری ہے بہ ہر لمحہ و گام
لوٹ کر آئے گی یہ صبح نہ یہ رات نہ شام
چھوٹ کر جائیگا اک چور جوانی کا یہ جام
یہ ترا حسن بھی فانی ہے، مرا عشق بھی خام
زیست کو مطربِ رقصاں، غزل خواں کر دیں

نسلِ آدم کا جوا، جبرِ مشیّت کا جہان
یعنی ماحول و وراثت کا یہ منحوس نشان
ذہنِ انسان پہ جو رکھی ہے فلک بوس چٹان
اپنے نغموں سے اسے توڑ کے رکھ دیں مری جان

دل کی چوٹوں سے اسے خاکِ پریشاں کر دیں

نسل اور رنگ کی پگھلی ہوئی زنجیروں کو
زنگ آلود سلاسل، نئی زنجیروں کو
قوم و مذہب ہی نہیں، ہاں سبھی زنجیروں کو
توڑ دیں جذبۂ ناموس کی زنجیروں کو

بند دنیا پہ درِ محبس و زنداں کر دیں

زندگی آگ ہو بکھرے نہ جہاں خون کی جھیل
نیا ایواں، نئی محراب، نئی ہو قندیل
ابدی خاک پہ ہو عدل و وفا کی تنزیل
اس جہنّم ہی کو فردوس میں کر دیں تبدیل

اپنی دُنیا ہی کو ہم جنّتِ انساں کر دیں

یہ دھندلکا تو ابھی اور بڑھے گا شاید
ابر یہ چاند کے رُخ سے نہ ہٹے گا شاید
یہ دھواں حشر تلک بھی نہ چھٹے گا شاید
یہ اندھیرا تو اندھیرا ہی رہے گا شاید

ہم بھی اک شمع اندھیرے میں فروزاں کر دیں
عید کی رات ہے عالم میں چراغاں کر دیں



دیپک

دیپک

باب دویم

پریم جھرنا

میرے من سے پریم جو پھوٹا تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟
چندر ماں آکاش سے پھوٹا دھرتی سے گل بوٹے
تاک جھانک کی دھن میں سورج چمکا تارے ٹوٹے
رات ملن کے کارن دن سے سانجھ کی نگری چھوٹے
پریم کی اک چنگاری پریتم رنگ رنگ سے پھوٹے
تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟
میرے من سے پریم جو پھوٹا تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟

پربت کی چھاتی سے ندّی پھوٹی شور مچاتی

موجوں کا سارنگ بجاتی میٹھے نغمے گاتی

میٹھے میٹھے نغمے گاتی، موتی خوب لٹاتی

جس نے دیکھے اُس نے پائے، جس نے پائے لوٹے

تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟

میرے من سے پریم جو پھوٹا تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟

سیپی کی گودی میں موتی گھُٹ گھُٹ کر رہ جائے

سیپی کے بندھن سے موتی کانپے اور تھرّائے

برکھا کی اک بوند کا بوسہ موتی کو گرمائے

موتی سیپی کے پٹ کھولے اور گھبرا کر چھوٹے

تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟

میرے من سے پریم جو پھوٹا تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟

ٹہنی میں سو کلیاں پھوٹیں، کلیوں میں سو رنگ

رنگوں سے اک خوشبو برسی، اور خوشبو سے امنگ

کمل کمل بھونروں نے چھیڑا رتوں[۱] راج کا چنگ
شبنم کے سو پیالے اک چمّے کی دُھن میں ٹوٹے

تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟
میرے من سے پریم جو پھوٹا تم مجھ سے کیوں روٹھے!؟



۱ بسنت رُت

دھنک

کرنوں کے چھّوں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری
جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگیں راجکماری
چُندری اپنی اُڑا رہی ہے برکھا رُت کی کنواری
اِنڈر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رہ رہ کر پچکاری
یا کر کے اشنان لکشمی سُکھا رہی ہے ساری



اک تارا

دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

جھَن سے نہ دھرتی پہ آ ٹوٹے جھل مِل کرتا تارا
اوشا کے ماتھے کی بندیا سورج کا گھوارا
پڑا کمل پر سپنا دیکھے جوبن رس متوارا
مدا، ما، کی کلیوں میں ہے خوشبو کی اک دھارا

دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

میں جوگن دکھیاری ٹھہری من جیون کا مارا
من جیون کا مارا ہے تو سارا جگ دکھیارا
نیّا میری ٹوٹی پھوٹی کوسوں دور کنارا
آشا کا اک تارا ہے اک تارے کی کیا سارا

دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

بجھا ہوا دیپک

جیون کی کُٹیا میں ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک
آشا کے مندر میں ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک
بُجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک
کجرائے ڈیوٹ پہ دھرا ہوں یوں کُٹیا میں ہائے
جیسے کوئل سیس نوا کر امبوا پر سو جائے
جیسے شاما گاتے گاتے کہرے میں کھو جائے
راگ چتا میں جیسے دیپک آپ بھسم ہو جائے
برہ میں جیسے آنکھ کسی کنواری کی پتھرا جائے
بُجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک
جیسے گھٹا میں ہو ہلکی سی اک بجلی بے جان
جیسے کسی سادھو کا مُردہ اور تھکا ایمان

آشاؤں کا مدفن ارمانوں کا قبرستان
رات کی اندھیاری میں ہوں میں مرتیو[1] کی مسکان[2]
جیسے اک بیوہ کی چتا ہو اور ویران شمشان[3]
بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک
اس ارماں میں کوئی میرے آنچل کو چھو جائے
ہلکی سی مسکان سے اپنی چندرما کو شرمائے
جیون کی تاریک کٹی میں تارے سے چمکائے
جلتا ہوں میں کب سے اپنی گودی کو پھیلائے
قسمت کی تاریکی ہر دم کاجل سا برسائے
بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک
بھٹکتا ہوں سنسار میں کب سے میں کرموں کا مارا
جل جل کر کوئلہ سا ہوا ہے میرا جیون سارا
جوتی کے آکاش پہ ہوں میں اک دھندلا سا تارا
میری جلتی چھاتی بابا، اگنی کا گھو ارا
لب پہ نرک ہے ہاتھوں میں ہے شعلہ کا اک تارا

[1] موت
[2] تبسم
[3] مرگھٹ

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

کاش کسی چندری کا آنچل مجھ پر سایہ ڈالے
مرے جیون کی چھایا ہوں بال وہ گھونگریالے
اور ندھر پھونکوں سے بجھائیں الّھڑ سونے والے
میرے اندھیرے سے پیدا ہوں چندرماں کے ہالے
تاریکی اور نور کے داتا اسّن لے میرے نالے
بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

چمکے ہیں اور ڈوبے ہیں یہ سورج چاند ستارے
جینے اور مرنے کے چکّر میں ہیں سب بیچارے
سانجھ سکارے سو جاتے ہیں یہ غفلت کے مارے
میرے امر آکاش پہ ہردم دہکے ہیں انگارے
وہ انگارے جن کی چمک کا تم حاصل ہو پیارے
بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

آتم، ہردے، جیون، امرتیو، ست یگ کلجگ، مایا
ہر رستہ پہ میں نے اپنے نور کا جال بچھایا

ا۔ سپہر ابدی

چاروں اور چمک کر اپنی کرنوں کو دوڑایا
جتنا ڈھونڈا اتنا کھویا، کھو کر خاک نہ پایا
بیت گئے جُگ پرچھیون میں مجھ تک کوئی نہ آیا
بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

آخر بالکل بُجھ جانے کی، ہولی جب تیّاری
آ کر میرے کان میں بولی اک شب یوں اندھیاری
ساجن مجھ کو مَن میں بسالو میں بھی ہوں دُکھیاری
جگ میں جس کو کوئی نہ پوچھے وہ قسمت کی ماری
اپنے دل میں مجھے بٹھالو اے جوتی کے رسیا
بُجھے ہوئے سے دیپک تم ہیں تھکی ہوئی اندھیاری!

اندھیاری کی باتیں سُن کر من بولا اُٹھ جاگ
یہی تری منزل ہے دیپک یہی ہیں تیرے بھاگ
بھڑک اٹھی سینہ میں برہ کی دبی ہوئی سی آگ
آشا کے مندر میں گونجا اک طوفانی راگ
آنکھوں میں جلتے آنسو تھے ہونٹوں پر تھیں آہیں
ڈالدیں اندھیاری کے گلے میں رو کر میں نے باہیں

مالا

ٹوٹ گئی وہ مالا سجنی، ٹوٹ گئی وہ مالا!

پھول، ستارے، آنسو جس کے دانے تھے وہ مالا

جس کے دانے دانے میں پیمانے تھے وہ مالا

جس کے پیمانوں میں سو میخانے تھے وہ مالا!

ٹوٹ گئی وہ مالا سجنی، ٹوٹ گئی وہ مالا!

بکھر گئے وہ موتی جس سے نادم تھے سیّارے

حُسن و محبّت، جیون، مرتیو ڈولیں مارے مارے

ٹوٹتے ہی اک پریم کی ڈوری رشتے ٹوٹے سارے

ٹوٹ گئی وہ مالا سجنی، ٹوٹ گئی وہ مالا!



بھکاری کی صدا

بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز
کیوں بجتا ہے اب بھی پاپی یہ جیون کا ساز

طوفان سر پر رات اندھیری، ہر دم اک منجدھار
پیالہ میرا ننّھا سا ہے اور قسمت کھیون ہار
بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز

یہ گڑھ تاروں کے ہمسائے، یہ اونچے استھان
یاں مانگے پر بھی ملتا ہے کب بھکشو کو دان

جس کو دیکھو داتا ہے اور سب داتا ہیں چور

راؤ، راتا، ملّا، نیتا، سب راجا! ہیں چور
بات نہ پوچھے بابا کوئی در در دی آواز

چاند ستارے لعنت بھیجیں، سورج دے دھتکار
بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھ کو دھکّے دے سنسار

مایا بن جیون ہے جگ میں جیون کا اپمان[1]
مایا ہی جنجال ہے بابا مایا ہی نروان[2]
بات نہ پوچھے بابا کوئی دردر دی آواز

بھیک بھکاری، دان اور داتا سب کو پردے جان پریم بھکاری کب رکھتے ہیں بھکشا پر ایمان

آس یہ ہے وہ چھم چھم کرتی کوٹھوں دوڑی آئے
اوپر سے اک آنسو ٹپکے اور پیالہ بھر جائے



[1] بے عزتی [2] نجات

باغی سنسار

اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے !؟

چندرماں سے جوت برس کر پربت پر آ سوئے

پربت سے سو جھرنے پھوٹیں پربت بیٹھا روئے

جاؤ سدھارو تم بھی سدھارو روکے تم کو کوئے

اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے !؟

جھرنے بڑھ کر دریا باجیں، دریا ساگر ہوئے

ساگر بادل بن کر اُمڈے اور کرنی پر روئے

جاؤ سدھارو تم بھی سدھارو روکے تم کو کوئے

اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے !؟

پات جھڑیں ٹہنی سے، ٹہنی ننگی ہو کر روئے

ٹہنی خود پیپل کو چھوڑے اِک دن ایسا ہوئے

جاؤ سدھارو، تم بھی سدھارو روکے تم کو کوئے

اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے !؟

باس کلی کا سینہ چیرے اور دُنیا پر چھائے
پھول سے رنگت باغی ہو کر تتلی بن اُڑ جائے
جاؤ سدھارو، تم بھی سدھارو رو کے تم کو کوئے
اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے!؟
تن اک دن جوبن کو چھوڑے آتم[1] تن دے تیاگ
مُرلی اک دن راگ کو پھونکے، اور مُرلی کو راگ
جاؤ سدھارو، تم بھی سدھارو رو کے تم کو کوئے
اس باغی سنسار میں پریتم کون کسی کا ہوئے!؟
جاؤ سدھارو، تم بھی سدھارو رو کے تم کو کوئے
اس نگری کی ریت یہی ہے جو پائے سو کھوئے
جاؤ سدھارو، تم بھی سدھارو رو کے تم کو کوئے
اس باغی سنسار میں پیارے کون کسی کا ہوئے!؟

[1] روح

ناگ

آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی
تن ہے خالی، من ہے سونا، روح سکوں کی پیاسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی
نازک نازک سے یہ پودے، ہری ہری یہ گھاس
ننھے ننھے یہ گل بوٹے، بھینی بھینی باس
صبح کی گودی میں جاگے ہو، اے نیندوں کے ماتے
سینہ تانے پھن پھیلائے کچھ کچھ کنڈلی مارے
اور جو یونہی ہاتھوں پہ اٹھالوں!؟
اور جو یونہی ہاتھوں پہ اٹھالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

سبزے کے دامن پر ہو یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے
سورج کی کرنوں میں ایسے چمک رہا ہے مکھڑا
جھل مِل جھل مِل جیسے جھومر کرے کسی مہرائی کا
اِس جھومر کو کیوں نہ چُرا لوں!؟
اس جھومر کو کیوں نہ چُرا لوں اے بانہی کے باسی
آ میں تن من میں بسا لوں اے بانہی کے باسی
مستی کا لہراتا پیکر، سر سے پا تک کالے
موت کی وادی کے رکھوالے، اے قہروں کے پالے
ابرِ سیہ اُترا ہے زمیں پر تازہ شبنم پینے
حبشی کوئی لوٹ رہا ہے یا موتی کے خزینے
میں بھی اک موتی کو اُٹھا لوں!؟
میں بھی اک موتی کو اُٹھا لوں اے بانہی کے باسی
آ میں تن من میں بسا لوں اے بانہی کے باسی

میری آنکھیں اک ابدیت دیکھ رہی ہیں تم میں
زہرِ غم تریاقِ محبّت دیکھ رہی ہیں تم میں
حُسن کی لامحدود جلالت دیکھ رہی ہیں تم میں
اور اپنے مقصود کی صورت دیکھ رہی ہیں تم میں

ٹھہرو اک تصویر بنالوں!؟
ٹھہرو اک تصویر بنالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

اپنی ہی مستی کی دُھن میں جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکنی کنواری مدرا[1] پی کر جھُومے

اندھیاری درپن ہے تمہارا، نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے مالا

اپنے گلے میں تم کو ڈالوں!؟
اپنے گلے میں تم کو ڈالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

[1] شراب

کسُم کی ٹہنی پر بھونروں نے یا ڈالا ہے ڈیرا
بن پتّوں کی شاخ پہ ہے یا کوئل رین بسیرا
بجلی سے معمور گھٹائیں اُمنڈ رہی ہوں جیسے
یا ساون کی کالی راتیں سمٹ گئی ہوں جیسے

آؤ تم کو بین بنا لوں !؟
آؤ تم کو بین بنا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی

یا کوئی مغرور جوانی جھوم رہی ہو پی کر
یا طوفانوں میں لہرائے جیسے کالا ساگر
پاپ کی میٹھی اندھیاری ہو، یا مستی کا سویرا
موت کی روشن تاریکی ہو یا جیون کا اندھیرا

امیدوں کا دیپ جلا لوں !؟
امیدوں کا دیپ جلا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی

نیلم کی تختی کی طرح ہاں زریں گھاس میں دمکو
سوزِ غضب بن بن کر تڑپو بجلی بن کر چمکو
بین کے مدھ ماتے نغموں پر بیخود ہو کر جھومو
گاہ مری وینا[1] پر ٹوٹو، گاہ زمیں کو چومو
کیوں نہ تمہیں دیوانہ بنا لوں؟!
کیوں نہ تمہیں دیوانہ بنا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی
موت کی گردن کی اے ہیکل، اے شنکر کے جوشن
بربادی کے زہری کنگن، اے کالی کے جھانجن
میں نے مانا زہر ہے تم میں، بس کی تم ہو مینا
لیکن میں نے سیکھا ہے "زہراب مقدر" پینا
ساقی کیا تم کو بھی بنا لوں؟!
ساقی کیا تم کو بھی بنا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی

[1] بین

اے بانبی کے بسنے والے تم کیا ہو زہریلے
لاکھوں ناگ ہیں انسانوں میں گورے، کالے، پیلے
مُلّا، نیتا، پیر اور پنڈت، راجے پانڈے لالے [1]
بستے ہیں دُنیا میں تم سے بڑھ کر ڈسنے والے
تم سے میں کیا من کو ڈسالوں !؟
تم سے میں کیا من کو ڈسالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

بس ہے تمہارا بوند برابر، ان کا زہر سمندر
ڈنک تمہارا ویرانوں تک، ان کا ڈستا گھر گھر
تیرا کاٹا اک دن جیوے ان کا کاٹا پل بھر
سحر تمہارا تن پر بولے ان کا جادو من پر
من سے ان کا زہر ہٹالوں ا
من سے ان کا زہر ہٹالوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

[1] بطرز عوام کے تلفظ میں کہا گیا۔ (ساغر)

آدم کی خلقی وحشت کا رنگ رچا ہے مجھ میں
انساں کی زہری فطرت کا زہر بھرا ہے مجھ میں
نفرت اور محبّت کا ہر جام پیا ہے میں نے
بِس کو امرت، اِمرت کو زہراب کیا ہے میں نے
تم کو بھی اک بوند چکھا لوں!؟
تم کو بھی اک بوند چکھا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں ہونٹوں سے لگا لوں اے بانبی کے باسی

رکھ دو ڈنک مرے ہونٹوں پر جان و دل میں کاٹو
زہر کو مصری بنتے دیکھو، اور دل میں شرماؤ
ٹھہرو کیوں کھوتے ہو اپنے میٹھے بِس کا مخزن
دُکھ کے بِس سے امر بنا ہے میرا تن من جیون
تم کو بھی جاوید بنا لوں!؟
تم کو بھی جاوید بنا لوں اے بانبی کے باسی
آؤ میں سینے سے لگا لوں اے بانبی کے باسی

انسانی ناگوں کے بیاں ہوں کیا زہری افسانے
تیرا ڈسنا چھپ چھپ کر ہے ان کا کھلے خزانے
ڈستے ہیں اور پھر کہتے ہیں موت نہ آنے پائے
تیرا بس تو رکھتا ہے ہر زخمی دل پر چھائے
دار وئے آلام چرالوں!؟
دار وئے آلام چرالوں اے بانبی کے باسی
آ ؤمیں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی
کڑوی تند نگاہوں سے سو گھونٹ لئے ہیں میں نے
ہستی کی تلخی کے لاکھوں جام پیے ہیں میں نے
تم میرے انسانی بس سے پانی مت ہو جاتا
باتوں باتوں میں نہ ابد کی نیند کہیں سو جانا
گیتوں کے چھینٹوں سے جگالوں!؟
گیتوں کے چھینٹوں سے جگالوں اے بانبی کے باسی
آ ؤمیں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

غزل

غزلیات

باب سوم

یہ نہیں اصلِ گلستاں، حاصلِ گلستاں ہے اور
جوششِ بہار پہ نہ جا، مرحلۂ خزاں ہے اور
شاخ پہ کِھل کے ٹوٹنا، پیشِ نسیم لوٹنا
قسمتِ یاسمن ہے اور، طاقتِ باغباں ہے اور
حجلۂ یاسمن کہاں، خار و خسِ چمن کہاں
برق و شرر کو لاگ ہے، جس سے وہ آشیاں ہے اور

دیر و حرم میں سر جھکے، سر کے لئے یہ ننگ ہے
جھکتا ہے اپنا سر جہاں، وہ در و آستاں ہے اور

قطعِ تعلّقات بھی، قیدِ تعلّقات ہے
توڑ کے رشتۂ وفا، مجھ سے وہ بدگماں ہے اور

دل سے چھپا چھپا کے یوں، آپ کو پوجتے ہیں ہم
جیسے بجائے دل کوئی عشق میں رازداں ہے اور

علمِ نکاتِ زندگی، ضبطِ کمالِ آگہی
فطرتِ رازجو ہے اور، منصبِ رازداں ہے اور

راہ جدا، سفر جدا، رہزن و راہبر جدا
میرے جنونِ شوق کی منزلِ بے نشاں ہے اور

ایک سفیرِ احتساب، ایک نفیرِ انقلاب
نعرۂ شیب ہے جُدا، نغمۂ نوجواں ہے اور

کشمکشِ خیال میں قطعِ سفر ہی ہو نہ جائے!؟
کوششِ راہبر نہ دیکھ، جذبۂ کارواں ہے اور

ایک نوائے سوز و رم، ایک میں سوز و نم، نہ رم
نغمۂ قدسیاں ہے اور، نالۂ خاکیاں ہے اور
لذّتِ درد کے عوض، دولتِ دو جہاں نہ لوں
دل کا سکون اور ہے، دولتِ دو جہاں ہے اور
ساغرِ مست اُٹھ کے خود قبلِ سحر انڈیل لے
تیرے سُبو میں کچھ ابھی بادۂ ارغواں ہے اور!

شعورِ نو کا سینہ، سوزِ نو سے مجمر آرا ہے
جو چنگاری ہے سورج ہے، جو شعلہ ہے ستارا ہے
حضورِ عشق اب دن رات جلووں کا تماشا ہے
کہ جو پنہاں ہی پنہاں تھا وہ اب پیدا ہی پیدا ہے
سبک کیوں جانتا ہے رہروانِ بے سر و پا کو
کہ ہر قطرہ یہاں صورت گرِ امواجِ دریا ہے
جنوں میدانِ دار و گیر میں ہنس ہنس کے کہتا ہے
ازل بھی اک تماشا تھا ابد بھی اک تماشا ہے

مری جودت کا یہ مصرف ہے اے بازی گرِ فطرت
کہ اک جانِ حزیں ہے اور تماشے پر تماشا ہے

حریمِ ناز سے کچھ بجلیاں پیغام لائی ہیں
کہ پھر منظور اُن کو امتحانِ عشقِ رسوا ہے

لباسِ کہنہ سوزِ حُسن نے سب خاک کر ڈالے
تمنّا کو بھی اک پیراہنِ نو کی تمنّا ہے

چھڑے گا پھر کوئی نغمہ بسے گا پھر کوئی عالم
ربابِ کُن میں پھر احساسِ تجدیدِ تمنّا ہے

نیا بادہ، نیا ساغر، نیا ساقی، نئے میکش
فروغِ خشتِ خُم سے اک عجب عالم برستا ہے

دلِ ساقی میں کیا سیلاب ہے یہ تو وہی جانے
نظر سے انقلابِ کیف کا طوفان پیدا ہے

ہر اک حق باطلِ خلاّق کی مخلوق ہے یعنی
نہ دوزخ ہے نہ جنّت ہے، نہ آدم ہے نہ حوّا ہے

کبھی اے سادہ دل تو نے نظر ڈالی بھی ہے دل پر
جو ہر انسان پر نازل ہوا یہ وہ صحیفا ہے
نیا اِک خاکۂ کون و مکاں تیّار ہے ساغرؔ
جبینِ دہر پہ ہلکا سا پرتو میں نے دیکھا ہے

جو نہیں بہار کا راز داں اُسے کیا وقوفِ بہار ہے
جسے کہہ رہے ہیں شمیم سب یہ چمن کا گرد و غبار ہے
یہ بجا کہ دورِ بہار ہے، یہ بجا کہ فصلِ بہار ہے
جو بکھر کے دوش پہ آپڑے تو یہ ابرِ گیسوئے یار ہے
یہ خرام اُن کا چمن چمن، یہ تبسّم اُن کا سمن سمن
یہ سکوت اُن کا روش روش کہ بہار محوِ بہار ہے
وہ چمن میں آئی ہیں جھومتی، اُسے توڑتی اُسے چومتی
جسے پھول کہتے ہیں فصلِ گل اسی کارواں کا غبار ہے
مجھے یاد ہیں وہ خرابیاں وہ نظر نظر میں گلابیاں
وہ کسی کی زمزمہ خوابیاں، مجھے اس گھڑی بھی خمار ہے

وہ ملاحتیں، وہ صباحتیں، وہ لطافتیں، وہ نزاکتیں
وہ نظر میں جب سے سمائی ہیں مجھے آنکھ اُٹھانا بھی بار ہے

وہ جدھر محل کے گزر گئی ہیں فضائیں غرقِ بہار ہیں
وہ جہاں جھجک کے ٹھہر گئی ہیں، وہیں ہجومِ بہار ہے

تو ہے جانِ گل، تو جہانِ گل، تو مکینِ گل، تو مکانِ گل
ترے دم قدم سے ہے گلستاں ترے دم قدم سے بہار ہے

یہ بلند قامتِ فتنہ گر، یہ لٹیں جبیں پہ اِدھر اُدھر
کہ حسین سرو کی اوٹ سے یہ طلوعِ ماہِ بہار ہے

یہ فلک پہ برقِ شرر فشاں، سرِ ارض اس کی یہ شوخیاں
کبھی نقلِ قامتِ یار ہے کبھی اصلِ قامتِ یار ہے

مری بے قراریٔ عشق ہی کو شکیب کہتے ہیں دیدہ ور
مری بے سکونیٔ شوق ہی کا لطیف نام قرار ہے

مری شاعری مری زندگی، مری زندگی مری شاعری
دل و جاں تو کیا ترے لطف پر مری شاعری بھی نثار ہے

اُٹھّا یہ کون ساغر و مینا لیے ہوئے — مستانہ لغزشوں کا سہارا لیے ہوئے

الزام کیوں ہے چشمِ تماشائے شوق پر — جلوے ہیں خود پیامِ تمنّا لیے ہوئے

اب نازِ عاشقی کو ہے اس دن کا انتظار — وہ آئیں میرے در پہ تمنّا لیے ہوئے

حدّ تعیّنات سے کوسوں نکل گئے — ہیں ان کا اور وہ میرا سہارا لیے ہوئے

ساغرؔ حدودِ عشرت و غم سے گذر گیا
ساقی کی اک نظر کا سہارا لیے ہوئے

ہائے وہ پچھلے پہر اِن کا غزلخواں ہونا — اک تبسّم سا وہ کلیوں میں نمایاں ہونا

اِن ستاروں نے تو دیکھا ہے ستاروں کی قسم — ہر طرف موجِ تبسّم سے چراغاں ہونا

وہ ترا دیکھنا غمگین تبسّم سے مجھے — مرگ اور زیست کا وہ دست و گریباں ہونا

گرمیٔ خاکِ محبّت کا پتہ دیتا ہے — ذرّے ذرّے کا تپِ شوق سے لرزاں ہونا

میری آشفتگیٔ شوق کی روداد نہ پوچھ — تیرے گیسو کو تو آتا ہے پریشاں ہونا

عشق پر اپنے تغافل سے حجابات نہ ڈال — اس حقیقت کے مقدّر میں ہے عُریاں ہونا

تیرے گیتوں سے مرے عشق کی بو آتی ہے — اے مغنّی تجھے آتا ہے غزل خواں ہونا

قیدِ ہستی کی بھی تعریف بدل دی تو سہی — کھیل سمجھے ہو میرا داخلِ زنداں ہونا

یاد ہیں ماضیٔ رنگیں کی وہ شامیں ساغر
سامنے ان کو بٹھانا وہ غزل خواں ہونا

بربطِ اشک پر انہیں نغمۂ غم سنا دیا
جو نہ زباں سے گا سکے اس کو نظر سے گا دیا

پھر تو کہو کہ کیا تجھے ہم نے یہ کم صلہ دیا
پیکرِ کیف کر دیا، صاحبِ غم بنا دیا

اس نے جو زعمِ حسن میں رخ سے نقاب اٹھا دیا
ہم نے بھی شوقِ دید میں دل کو نظر بنا دیا

سنگ کو بت کی شکل دی صنعتِ بت تراش نے
میں نے مگر تراش کر بت کو خدا بنا دیا

خالق و کارساز تھا جذبۂ آذریٔ عشق
جس پہ نگاہ ڈال دی اس کو خدا بنا دیا

ساغرِ مست حسن کو بزم میں فکرِ شعر کیا
قصۂ دردِ عاشقی نظم کیا سنا دیا

اے حیرتیٔ حسنِ نظر سوز ادھر دیکھ
غماز ہے وارفتگیٔ چشم و نظر دیکھ

کس دن کیلئے ہے ترا یہ ذوقِ نظر دیکھ
خود جلوہ سراپا یہ تقاضہ ہے ادھر دیکھ

اٹھنے کو ہے محفل میں قیامت کی نظر دیکھ
کچھ دیر میں ہے کارِ جہاں زیر و زبر دیکھ

کچھ موت نہیں منزلِ انجامِ سفر دیکھ
عقبیٰ بھی ہے دنیا کی طرح راہگزر دیکھ

مرنا تو کجا عشق میں آساں نہیں جینا
حسرت ہے ترے دل کو تو یہ کام بھی کر دیکھ

منظر جسے کہتے ہیں نرا رنگِ نظر ہے
اس رخ سے کبھی آئینۂ شام و سحر دیکھ

اعمال کا انجام ہے فردوس و جہنّم
افسوں گری خیر و فسوں سازی شر دیکھ

قربت کی جلالت سے فضا کانپ رہی ہے
پہلے انہیں پھر جنبش ہر پردۂ در دیکھ

آوارہ ہیں کیوں تیرے لئے شام و سحر سوچ
تکتے ہیں تجھے دور سے کیوں شمس و قمر دیکھ

خورشید کی جانب جو اٹھاتا ہوں نگاہیں
ہر ذرّہ سے آواز یہ آتی ہے ادھر دیکھ

مستوں کو تو آئینہ ہے ہر قطرۂ صہبا
ساغر کے تموّج میں یَم شام و سحر دیکھ

زہے فیضِ کیفِ تمامِ محبّت
عداوت ہے مجھ کو پیامِ محبّت

نگاہیں پیامی ادائیں پیامی
دیئے جا رہے ہیں پیامِ محبّت

ہوئی کس کے رنگیں لبوں کو یہ جنبش
مہک دے رہا ہے مشامِ محبّت

کلیمِ محبّت ہیں نمناک آنکھیں
ہیں نازک سے آنسو کلامِ محبّت

محبّت ہمیشہ محبّت رہے گی
نہ بدلا نہ بدلے نظامِ محبّت

خدا کے لئے آؤ گھل مل بھی جاؤ
عداوت نہیں اختتامِ محبّت

وہ لغزیدہ لغزیدہ آنا کسی کا
بہکتا ہوا سا خرامِ محبّت

کنکھیوں سے تجدیدِ پیمانِ الفت
وہ نیچی نظر سے سلامِ محبّت

شرابی تبسم، چھلکتی سی آنکھیں
مجسم ہیں ساغر وہ جامِ محبت

بادِ صبا یہ جھومتی آئی ہے کس دیار سے
جیسے نسیم پھوٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے
گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا
کیف اڑا کے لائی ہے موجِ خرامِ یار سے
منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے
مثلِ نظر گزر رہی جا عالمِ اعتبار سے
فقر کو میرے بیر ہے جذبۂ انکسار سے
جنسِ جنوں بھی ہو تو میں بھیک نہ لوں بہار سے
موڑ کے منہ بہار سے، پھیر کے رُخ ہزار سے
کھیل رہی ہیں نکہتیں، ان کے گلے کے ہار سے
زلف میں یاسمن کے پھول، ہوسم گل کے وہ رسول
توڑ سے ہوئے بہار کے، چھینے ہوئے بہار سے

رُوح نہ تھی نسیم میں، جان نہ تھی بہار میں
کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اُٹھے کنار سے

جوشِ نمو کو گُل بہ گُل لالہ بہ لالہ دیکھ کر
روحِ جنوں اُبل پڑی خُم کدۂ بہار سے

آج یہ ڈوبتے ہوئے نجمِ سحر نے کیا کہا
خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے

گردشِ روزگار خود میرے جنوں سے دب گئی
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

ساغرِ خام کا ہی پی بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

رند ہوں کب دوسرے کا آسرا رکھتا ہوں میں
آنکھ میں ساغر نظر میں میکدہ رکھتا ہوں میں

دل کے ہر گوشہ میں ذوقِ صد بلا رکھتا ہوں میں
بحر میں طوفان ساحل آشنا رکھتا ہوں میں

نقطۂ ذوقِ پرستش مرکزِ حُسنِ خیال
ایک قشقہ حاصلِ صد بتکدہ رکھتا ہوں میں

سرد نبضِ ناخدا ہے خوفِ طوفاں سے تو ہو
پردۂ ہر موج میں سو ناخُدا رکھتا ہوں میں

شورشِ طوفاں مرے پیغام کی ہے منتظر
سانس میں دریا نظر میں ناخدا رکھتا ہوں میں

حُسن دیوانہ ہے جس کا عشق ہے جس کا اسیر
وہ کرشمہ دامنِ دل میں چھپا رکھتا ہوں میں

معصیت بھی نامکمّل، اتّقا بھی ناثواب
مرحبا، کیا اہرمن اور کیا خدا رکھتا ہوں میں

منزلِ انجم سے آگے ہے مرا بامِ عروج
لامکاں کے دوش پر بھی نقشِ پا رکھتا ہوں میں

وہ بہار آئی وہ تنکے آشیاں کے کانپ اٹھے
شاخ پہ بیچارۂ برق و بلا رکھتا ہوں میں

وہ مسافر ہوں کہ رہنِ ہادی و رہبر نہیں
ہر قدم پر اپنے دم کا آسرا رکھتا ہوں میں
امتحان ذوقِ اسیری کا مجھے منظور ہے
موسمِ گل میں درِ زنداں کھلا رکھتا ہوں میں
جس کا ہر قطرہ ہے ساغر موجۂ آبِ حیات
جام میں بہتی ہوئی وہ کیمیا رکھتا ہوں میں

سُنا ہے یہ جب سے کہ وہ آ رہے ہیں
دل و جاں دیوانے ہوئے جا رہے ہیں
معطّر، معطّر، خراماں، خراماں
نسیم آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں
نگاہیں، گلابی، ادائیں شرابی
بہکتے مچلتے چلے آ رہے ہیں
فلک بن گیا میرا دوشِ تخیّل
سہارا لئے وہ چلے آ رہے ہیں
نظر ان کے جلووں کے طوفاں میں گم ہے
ہجومِ نظر سے وہ گھبرا رہے ہیں
انہیں بڑھ کے کیا نذر دیں ہم الٰہی!
متاعِ دل و جاں پہ شرما رہے ہیں
کبھی لعل و گوہر کبھی لالہ و گل
ابھی ہنس رہے تھے ابھی گا رہے ہیں
کرم کی یہ مجبوریاں، اللہ اللہ
نظر سے ولا سے دئے جا رہے ہیں

مری روح میں بیٹھ کے ہر وقت ساغر
وہ اک نغمۂ جاوداں گا رہے ہیں

آیا وہ مرا جانِ بہاراں نظر آیا
ہر سمت گلستاں ہی گلستاں نظر آیا

پھر چھیڑ دیا روح کو مضرابِ نظر نے
پھر تیر سا پیوست رگِ جاں نظر آیا

پھر کاکلِ شب رنگ میں چمکا رخِ روشن
پھر کفر کے آغوش میں ایماں نظر آیا

کافر ہوں میں کافر ہوں مرا کفر محبت
یہ کفر مجھے حاصلِ ایماں نظر آیا

تشکیل بھی محدود تھی، تصویر بھی محدود
لیکن وہ تصور میں نمایاں نظر آیا

گلشن میں ترے دستِ حنائی کے اثر سے
ہر برگ و شجر شعلہ بداماں نظر آیا

وہ سلسلۂ لغزشِ مستانۂ پیہم
میخانہ سا گلشن میں خراماں نظر آیا

یہ بھی کسی گاتی ہوئی ہستی کی کشش ہے!
ساغر جو مسوری پہ غزل خواں نظر آیا

اسے ترے کیفِ شرابِ التفات
جھومتی ہے میرے دل کی کائنات

لے نہ ڈوبے آج طوفانِ کرم
کائنات و ماورائے کائنات

رقص میں تیرے اثر سے مہر و ماہ
وجد میں تیری نظر سے کائنات

زمزمے تیرے تکلّم پر نثار
رقص کرتی ہے ترے ہونٹوں پہ بات

چُھپکے چُھپکے یہ ترا مہر و کرم
راز رہ سکتی نہیں لیکن یہ بات

خاکِ دل سے پھر اُٹھیں چنگاریاں
پھر بھڑک اُٹھی مری شمعِ حیات

اک سراپا ناز کو تھا ہم سے شوق
کہہ سکیں گے کس سے دنیا میں یہ بات

پھر اسی رسمِ ستم کو زندہ کر
موت ہے تیری نگاہِ التفات

ہوشیار اے ساغرِ دیوانہ خُو
پھر جنوں کے موڑ پر آئی حیات

جگمگا اُٹھتے ہیں مس کرتے ہی لاکھوں آفتاب
جب کسی ذرّے پہ ہنس کر ہات رکھ دیتا ہوں میں

ہے کمالِ رقصِ صوفی بھی نشاطِ پادشاہی
بڑی مدّتوں میں ٹوٹا، یہ فریبِ خانقاہی
یہی میری آدمیت کی دلیلِ برتری ہے
کہ لگا نہیں جبیں پہ کبھی داغِ بے گناہی

مجھے کیوں ہو فکرِ شاہد کہ معاملہ ہے روشن
ہیں تری کھلی شہادت، تو مری کھلی گواہی

ہے عجیب لا اُبالی، مرا مسلکِ جنوں بھی
نہ اصولِ پاکبازی نہ شعارِ بے گناہی

مری زندگی میں ساغرؔ وہ بلا کا بانکپن ہے
نہ اطاعتِ اوامر نہ پرستشِ نواہی

وہ میرا جانِ ہر محفل کہاں ہے
نگاہِ شوق کی منزل کہاں ہے

ستارو، تم نے دیکھا ہو تو لا دو
مری امید کا حاصل کہاں ہے

مرا آنسو سہی انمول موتی
تمہارے ہار کے قابل کہاں ہے

تمہارا حسن میرے دل کی منزل
تمہارے حسن کی منزل کہاں ہے

ہے میخانہ حقیقت ہی حقیقت
یہاں بحثِ حق و باطل کہاں ہے

غافل ہیں ماہ و انجم، سوتے ہیں مرغ و ماہی
یہ وقت ہے خدارا، اک آہِ صبحگاہی

پر تو نے تیرے بخشی گلشن کو پادشاہی
کانٹوں کو بھی چمن میں ہے زعمِ کج کلاہی

فرقت میں اب بھی ہیں لے دے کے دو سہارے
اک گریۂ شبانہ، اک آہِ صبحگاہی

کہاں کی شاخِ گل گر اتّحادِ گلستاں ہوتا
تڑپتی بجلیوں کی رو پہ اپنا آشیاں ہوتا

دلِ نازک میں کیا اُٹھتے ہیں طوفاں دیکھ لیتا ہوں
نظر سے ان کی اپنا غم نمایاں دیکھ لیتا ہوں

شگفتِ غنچۂ و گل میں، طلوعِ ماہ و انجم میں
جہاں میں چاہتا ہوں، ان کو خنداں دیکھ لیتا ہوں

مری رقصندہ کشتی کم نہیں کچھ ساغرِ جم سے
کہ ہر طوفان کو ما قبلِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

قفس میں جب کبھی یادِ چمن چُٹکی سی لیتی ہے
کلیجہ تھام کر سوئے گلستاں دیکھ لیتا ہوں

قفس تبدیلِ ہیئت کر کے بن جاتا ہے خود گلشن
تصوّر کو گلستاں در گلستاں دیکھ لیتا ہوں

مری نومیدیاں امید کے دیپک جلاتی ہیں
اندھیرے میں بھی اک بزمِ چراغاں دیکھ لیتا ہوں

لگی رہتی ہیں آنکھیں تند موجوں کے تھپیڑوں پر
کہ بن قطرہ اُٹھائے نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

جنونِ حرّیت نے وہ بصیرت مجھ کو بخشی ہے
تقاضاتِ در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

حدودِ دانہ و خرمن سے آگے ہے نظر میری
رگِ ہستی میں جولاں خونِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

لچک کر ٹوٹ جاتی ہے کلائی برقِ لرزاں کی
خطِ ساغر میں جب نبضِ بہاراں دیکھ لیتا ہوں

تڑپ کر ہاتھ رکھ دیتی ہے قدرت میری آنکھوں پر
جو اک ادنیٰ حقیقت کو بھی عریاں دیکھ لیتا ہوں

مرا ٹوٹا ہوا دل بھی عجب آئینہ ہے ساغرؔ
انہیں اکثر اس آئینے میں خنداں دیکھ لیتا ہوں

محرمِ طبعِ صبا ہوں یوں نہ شرمائے خزاں
تیری بے رنگی بھی موجِ رنگ ہے میرے لئے

ہے مرے پیشِ نظر معمارِ عالم کا مزاج
شورِ ہستی میں رباب و چنگ ہے میرے لئے

نو اسیرِ گلستاں کا خیر مقدم دیکھئے
غنچہ غنچہ باغ کا دل تنگ ہے میرے لئے

اس افق سے اک حیاتِ تازہ ہوتی ہے طلوع
اک نویدِ امن طبلِ جنگ ہے میرے لئے

تجربوں نے اس قدر احساس نازک کر دیا
قطرۂ شبنم بھی ضربِ سنگ ہے میرے لئے

طاقِ حرم و کرسی و منبر سے گزر جا
دیوار سے محراب سے اور در سے گزر جا

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو، جہنم ہو کہ جنت
ہر جادہ و ہر منزل و ہر در سے گزر جا

ہر گام پہ قزاق ہیں ہر موڑ پہ رہزن
بچنا ہے تو جذبات کے محشر سے گزر جا

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں؟
آلام کے مواج سمندر سے گزر جا

سایہ ہے تخیل کا توہّم کا ہے پرتو
نیکی سے گزر، کارگہِ شر سے گزر جا

تو مشعلِ جاوید رہِ ہستی و مستی
حدِ اثرِ ہادی و رہبر سے گزر جا

کوئی تری منزل نہیں اے جلوۂ رعنا
چشم و نگہہ و ناظر و منظر سے گزر جا

کب تک نگۂ ساقیٔ کمسن کی غلامی
میخانۂ و جام و مئے و ساغر سے گزر جا

فطرت تری طوفان طبیعت تری سیلاب
ہر گوشۂ پیمانہ و ساغر سے گزر جا

یہ بھی تری منزل نہیں اے مرد مسافر
حیرت کدۂ گنبد بے در سے گزر جا

مستی ہے تو مستی ہے جنوں ہے تو فسوں ہے
موقع جو ملے پیشیٔ داور سے گزر جا

اس بھیڑ میں کیوں تیرے قدم اُٹھ نہیں سکتے
منظر سے نہیں تو پس منظر سے گزر جا

یہ ظالم ہوائیں، یہ کافر گھٹائیں
چلی آئیں تنہا، انہیں بھی تو لائیں

نمرود ان سے مس ہو گیا کوئی جھونکا
مہکتی ہوئی آ رہی ہیں ہوائیں

نہیں کوئی باب قبول آسماں پر
بھٹک کر کدھر جا رہی ہیں دعائیں

ہماری عبادت تو ہے یاد انکی
وہ معبود ہو کر ہمیں بھول جائیں

اسی آرزو میں بسر ہو رہی ہے
پھر اک بار تم کو کہیں دیکھ پائیں

چلو ان کے در پر پھر اک روز ساغر
مقدر کو اک بار پھر آزمائیں

اللہ رے یہ سلسلۂ مست کلامی
ہر سانس ہے پیغامبر کیفِ دوامی

دنیائے محبت میں کسے فرصتِ تکمیل
ہر پختگیٔ شوق پہ ہے پرتوِ خامی

اللہ رے یہ سلسلۂ نامہ و پیغام
آتا ہے پیامی کبھی جاتا ہے پیامی

اُس نور سے انوار فشاں ہے دلِ شاعر
مہر و مہ و انجم جسے دیتے ہیں سلامی

الفت ہے مری نسل محبت مرا مذہب
افغاں ہوں، ہندی ہوں، نہ ترکی ہوں نہ شامی

ہر رسم پہ خنداں ہے مری فکرِ جہاں بیں
ہر وہم سے بالا ہے مری ذاتِ گرامی

ساغرؔ اسی میخانہ کا ہے رندِ بلانوش
جس میکدۂ شوق کا مے نوش تھا جامیؔ

دل حسن کے ہاتھوں سے دامن کو چھڑائے ہے
لیکن کوئی دامن کو کھینچے لئے جائے ہے

کیا شے ہے محبت بھی کہسار کو ڈھائے ہے
ترتوں کو ڈبوئے ہے ڈوبوں کو ترائے ہے

جب پریم کی ندّی میں طوفان سا آئے ہے
نیّا ہی نہیں ندّی ہچکولے سے کھائے ہے

مطرب ارے او مطرب کیوں جھوم کے گائے ہے
تو آگ بجھائے ہے یا آگ لگائے ہے

یہ تیرا تصوّر ہے یا میری تمنائیں!!
دل میں کوئی رہ رہ کر دیپک سے جلائے ہے

جس سمت نہ دنیا ہے اے دوست نہ عقبیٰ ہے
اُس سمت مجھے کوئی کھینچے لئے جائے ہے

میخانے کی دوری تو ہے ایک نفس ساغرؔ
ساقی مرا کوسوں سے سو جام پلائے ہے

کیوں دلِ بیقرار کیوں اے دلِ بیقرار کیوں !؟

عشق کی نامرادیاں ہونے لگی ہیں بار کیوں !

سینہ ہو داغدار کیوں آنکھ ہو اشکبار کیوں ؟

غم کوئی تاجری نہیں غم کا ہو اشتہار کیوں ؟

شور چکاں ہو کیوں نسیم، پھول ہوں شعلہ بار کیوں ؟

غمزدہ بہار سے، چھیڑ کرے بہار کیوں ؟

میرا چمن ہے بے نسیم میرا گلاب بے شمیم

مجھ سے فسردہ بخت سے روٹھ گئی بہار کیوں ؟

نزہتِ ہر چمن تھا میں، روحِ گل و سمن تھا میں

چھوڑ کے مجھ کو چل دیا، قافلۂ بہار کیوں ؟

خام ہے ذوقِ انتظار زیست اگر ہوئی ہے بار

انکا جب انتظار ہے موت کا انتظار کیوں ؟

صبر نہیں ہے زندگی، جبر نہیں ہے عاشقی

دل پہ نہیں ہے اختیار، ان پہ ہو اختیار کیوں ؟

اپنا ہی بُت کدہ ہے جا، اپنے ہی بُت پہ لوٹ جا
تیرے دماغ و دل پہ ہو دیر و حرم کا بار کیوں؟
ساغرِ مست اس کو بھی عرقِ سبو و جام کر
میری حریف دور ہے گردشِ روزگار کیوں؟

بیتاب شوق جذبۂ بے اختیار نے
تڑپا دیا انہیں بھی دلِ بے قرار نے
شکوہ جہاں کو ہے ستمِ بے شمار کا
لوٹا ہمیں ترے کرمِ بار بار نے
مرجھائے سے وہ پھول وہ خار و خسِ چمن!
ہمس کر لیا خزاں نے جو بخشا بہار نے
وہ جانِ رنگ و بو جو گلستاں میں آگئی
سجدے کئے تڑپ کے نسیمِ بہار نے
پھر میری عرضِ شوق میں پیدا ہیں جرأتیں
جھک کر یہ کیا کہا نگہِ شرمسار نے

یہ گُل، روش، یہ تبسّم سمن سمن
ان کی مدد سے آگ لگا دی بہار نے

ابھروں گا پھر لباسِ خزاں میں بہ طرزِ نو
مجھ کو کچل دیا جو خرامِ بہار نے

بے اختیاریوں کا فسوں کچھ نہ پوچھئے
مختار کر دیا دلِ بے اختیار نے

پوچھو نہ بادہ نوشئ ساغرؔ کی داستاں
ڈھالی گلوں نے اور پلائی بہار نے

لعل و گہر لٹائے جا، شمس و قمر لٹائے جا
ارض و سما ترے نثار ہاں یونہی مسکرائے جا

شورِ نوا ہے زندگی ورنہ یہ کیا ہے زندگی
بربطِ بے نوا سہی نغمۂ شوق گائے جا

فرصتِ یک نفس نہ دے شورشِ کائنات کو
ساغرِ مست گائے جا ساغرِ مست گائے جا

جو اک نغمہ بھی دل سے عندلیبِ زار ہو جائے
چمن کیسا، چمن کی خاک بھی بیدار ہو جائے

ترے سر کی قسم گر تو نہ ہو میرے تصوّر میں
مری نازک طبیعت پر یہ دنیا بار ہو جائے

اسی لمحے کو شاید یاس کی تکمیل کہتے ہیں
محبّت جب مزاجِ عاشقی پر بار ہو جائے

یہ کیا چیز شانوں پہ بکھری پڑی ہے
کہ وارفتگی ناز فرما رہی ہے

مبارک گلستاں کو بادِ بہاری
تخیّل ہیں یاں خاک سی اُڑ رہی ہے

نہ گُل ہیں نہ کلیاں، نہ کلیاں نہ کانٹے
تہی دامنی سی تہی دامنی ہے

نہ موجیں نہ طوفاں، نہ مانجھی نہ ساحل
مگر من کی نیّا بہی جا رہی ہے

چلا جا رہا ہے وفا کا مسافر
جدھر بھی تمنّا لئے جا رہی ہے

بشکل تبسّم یہ تیرے لبوں پر
تبسّم نہیں میری افسردگی ہے

ہے ساجد سے مسجود سجدوں سے کعبہ
مری بندگی سے تری داوری ہے

قیامت ہے ظالم کی کافر جوانی
اشارہ خدائی، نظر داوری ہے

مری خاک پر سازِ یک تار لیکر
امید اب بھی اک گیت سا گا رہی ہے

مرے من کے بہروپ مت پوچھ ساغر
کبھی ہے کنھیّا، کبھی بنسری ہے

تم جو چھیڑو مسکرا کر ساز ہے
ورنہ ساز اک تارِ بے آواز ہے

آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
دور تک آواز ہی آواز ہے

خواب اے عشقِ مغنّی تابکجا — اُٹھ محبت گوش برآواز ہے
قہقہے بھی ہیں خروشِ دردِ غم — گیت بھی اک دُکھ بھری آواز ہے

ٹوٹ کر ساغر بنا کرتا ہے دِل
ساز کا حاصل شکستِ ساز ہے

میں نغموں کے دریا بہاتا رہوں گا — ترنّم کے طوفاں اُٹھاتا رہوں گا
بہت دور سے یاد آتا رہوں گا — ہیں ساون ہیں ان کو رُلاتا رہوں گا
رہا گر ترے نطق کا فیض جاری — تو ملہم کو حیراں بناتا رہوں گا
محبّت کی مایوسیوں کی قسم ہے — ابد تک اُنہیں آزماتا رہوں گا
وہ محفل میں میری زباں بند کردیں — نظر سے کہانی سُناتا رہوں گا
اُجڑتی رہے گی لُٹیرے من کی بستی — نئی دل کی بستی بساتا رہوں گا
وہ دامن کو اپنے جھٹکتی رہیں گی — جو میں خاک ہوں اُڑ کے چھاتا رہوں گا
شکستہ دلی حاصلِ زندگی ہے — یہ آئینہ سب کو دکھاتا رہوں گا
جنونِ وفا جب تلک ہے سلامت — محبّت کو وحشی بناتا رہوں گا
نہ جانے کب آجائے وہ جانِ عالم — محبّت کی دُنیا سجاتا رہوں گا
زہے فیضِ ساقی، زہے کیفِ باقی — میں ساغر ہوں پیتا پلاتا رہونگا

شمیم سر بسر بن کر، نسیم رہگزر ہو کر
مہک جاتی ہے ہستی وہ گزرتی ہیں جدھر ہو کر

لپٹ جاؤں گا قدموں سے نقوشِ رہگزر ہو کر
وہ آئیں تو مرے گھر تک وہ گزریں تو ادھر ہو کر

تبسم ان کا رہ جائے جو شمعِ رہگزر ہو کر
ہر اک رہزن ابھی مشعل دکھائے راہبر ہو کر

مرا ذوقِ نظر تو صرف پرتو ہے حجابوں کا
نظر کو جرأتیں بخشی ہیں تم نے پردہ در ہو کر

ترے نام پر نوجوانی لٹا دی
جوانی نہیں زندگانی لٹا دی

یہاں عشرتِ زندگانی لٹا دی
وہاں دولتِ جاودانی لٹا دی

تقاضہ، تقاضہ، مقدر، مقدر
جوانی نے خود ہی جوانی لٹا دی

بہ ہر کو بہارے، بہ ہر سو نگارے
نگاہوں نے اپنی جوانی لٹا دی

یہ اک روز مٹتی، یہ اک روز لٹتی
یہ اک چیز تھی آنی جانی لٹا دی

جوانی کے لٹنے کا غم ہو تو کیوں ہو
جوانی تھی فانی، جوانی لٹا دی

خرد کو یہ ضد تھی نہ لٹتی یہ دولت
اسی ضد پہ ہم نے جوانی لٹا دی

وہ گلیاں ابھی تک حسین و جواں ہیں
جہاں ہم نے اپنی جوانی لٹا دی

محبت میں ہم اور کیا کچھ لٹاتے
متاعِ غرورِ جوانی لٹا دی

جوانی نے بڑھ کر محبت کو لوٹا
محبت نے ہنس کر جوانی لٹا دی

درِ خمستاں سے جوانی ملی تھی　　درِ خمستاں پہ جوانی لٹا دی
جو مل جائے تو عمرِ رفتہ سے پوچھوں　　یونہی لٹ گئی یا جوانی لٹا دی
جو ساقی نے ہنس کر کبھی جام بخشا　　تو ساغر نے اٹھ کر جوانی لٹا دی

حیرت سے تک رہا ہے جہانِ وفا مجھے　　تم نے بنا دیا ہے محبت میں کیا مجھے
ہر منزلِ حیات سے گم کر گیا مجھے　　مڑ مڑ کے راہ میں وہ ترا دیکھنا مجھے
کیفِ خودی نے موج کو کشتی بنا دیا　　فکرِ خدا ہے اب نہ غمِ ناخدا مجھے
موجوں سے ہمکنار تھا اک جستِ شوق میں
تکتی ہی رہ گئی نگہِ ناخدا مجھے

ذرا کچھ اور گہرا رنگ دے چشمِ گلابی کو　　بہت کچھ میری فطرت میں ہے گنجائش خرابی کی
فروغِ موجِ مے ہے شعلۂ رنگِ حنائی سے　　چھلکی جاتی ہے چھاتی دستِ ساقی میں گلابی کی
نظر ملتے ہی تجدیدِ تمنا پھر ہوئی ساغر
نگاہِ حسن نے بنیاد پھر رکھ دی خرابی کی

اک آغوشِ تمنا وا زمیں سے آسماں تک ہے　　محبت ہی محبت ہے مرا قبضہ جہاں تک ہے

مرے نزدیک بیٹھو اور نفس سے عطر برساؤ — "بہاراں" نکہتوں کے اس مہکتے کارواں تک ہے
الٰہی بدگماں ہو جائیں وہ معصوم نظریں بھی — گناہِ عشق کی لذّت نگاہِ بدگماں تک ہے
حذر اے جذبۂ الفت یہ رسوائی بھی ہے کیا کم — کہ رازِ عشق کا پرتو "ضمیرِ رازداں" تک ہے
نظر بچتے ہی ان کا آستاں ہوگا مرے سجدے — یہ میری گریہ مسکینی نگاہِ پاسباں تک ہے
شگفتِ لالہ و گل سے طلوعِ ماہ و انجم تک — ہے اک حشرِ تبسم حُسن کا پرتو جہاں تک ہے
انہیں بجتے ہوئے پتّوں سے گلشن پھوٹ نکلیں گے — بہاروں کا یہ ماتم صرف انجامِ خزاں تک ہے
فضا پر موت چھا جائے جو ہم خاموش ہو جائیں — کہ ساری گرمیٔ محفل ہماری داستاں تک ہے
چمن کی سمت کروٹ بھی نہ لینگی بجلیاں سو سو — کہ بیم اضطرابِ برق میرے آشیاں تک ہے

دلِ گرم و جواں قلقل، دلِ گرم و جواں مینا
جنونِ مے کشی ساغر دلِ گرم و جواں تک ہے

کیا التفات اور کیا بے نیازی — سب ان کا شوقِ دیوانہ سازی
حسن اور مجھ کو یوں مُنہ لگائے — ساغر نوازی، ساغر نوازی
تیرے رُخِ انور کی جھلک سے — حیرت نے سیکھی آئینہ سازی
خود عشق منزل اپنے سفر کی — کیسا حقیقی؟ کیسا مجازی
دل کو ہمارے نالوں کا چسکا — اور ان کو شوقِ نغمہ نوازی

انجام دل کا اللہ حافظ　　یاں آرزوئیں واں بے نیازی
یہ صحنِ مسجد، یہ دورِ ساغر
بہکے نمازی، ڈوبے نمازی

پئیں ساقیا، کیا جوانی میں پانی　　مئے ارغوانی، مئے ارغوانی
زہے فیضِ کیفِ نسیمِ جوانی　　یہ راتیں گلابی، یہ صبحیں سہانی
عجب داستاں آفریں ہے جوانی　　نگاہیں فسانہ، ادائیں کہانی
محبت حقیقت نہ نفرت حقیقت　　نہ یہ جاودانی، نہ وہ جاودانی
نہ رہبر، نہ مشعل، نہ جادہ، نہ منزل　　چلی جا رہی ہے جوانی دوانی
تڑپ جائے پیری مچل جائے میری　　جو میں چھیڑ دوں اُٹھ کے سازِ جوانی
بغاوت جوانوں کا مذہب ہے ساغر
غلامی ہے پیری، بغاوت جوانی

کچھ دور نہیں ہے وہ زمانہ　　بجلی ہوگی نہ آشیانہ
محکم ہے یہ عزمِ باغیانہ　　یا ہیں نہیں یا نہیں زمانہ
بجلی جو گری تو غم نہ کیجے　　سو بار بنے گا آشیانہ
پرواز کر اے اسیرِ گلشن　　ہر شاخ ہے تیرا آشیانہ

تخریب مری جنونِ تعمیر ق تعمیر مری مدافعانہ
بُنیادِ حیات رکھ رہا ہوں تخریب تو ہے فقط بہانہ

تعبیر نہیں ہے عصر سے تو ہے تیرے وجود سے زمانہ
اے جذبۂ تشنگی کے دشمن حسرت بھی ہے اک شراب خانہ

پھر ذوقِ نظر ہوا ہے گستاخ ہاں کوئی نگہ کا تازیانہ
اُس مستِ خرام کی نہ پوچھو چلنا پھرنا شراب خانہ

ہے اصل صداقتوں کی اتنی نکھرے ہوئے جھوٹ کا فسانہ

سوتا مجھے دیکھ کر مسلسل
چپکے سے گزر گیا زمانہ

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم محبّت سے بھی ماورا ہو گئے ہم
اشاروں اشاروں میں کیا کہہ گئیں وہ نگاہوں نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم

ترے دل میں تیری نظر میں سما کر تمنّائے ارض و سما ہو گئے ہم
حقیقت نہ تھی دل لگانے کے قابل حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم

محبّت کی کچھ تلخیوں کی بدولت مغنّی شیریں نوا ہو گئے ہم
نہ دیکھے گئے اُس نظر کے تقاضے زِ سر تا بہ پا مدّعا ہو گئے ہم

سمجھنا ترا کوئی آساں ہے ظالم — یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم
بھٹک کر پڑے رہزنوں کے جو ہاتوں — لُٹے اس قدر رہنما ہو گئے ہم
جنونِ خودی کا یہ اعجاز دیکھو — کہ جب موج آئی خدا ہو گئے ہم
چٹکنے نہ پائی تھیں کلیاں چمن میں — کہ اس جانِ گل سے جدا ہو گئے ہم
محبّت نے عمرِ ابد ہم کو بخشی — مگر سب یہ سمجھے فنا ہو گئے ہم

نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغرؔ
کہ خاکسترِ میکدہ ہو گئے ہم

ہجومِ خیالات ہے اور کیا ہے — وہی بارِ آفات ہے اور کیا ہے
وہی ہم ہیں اور آرزوئے تلاطم — وہی شورِ جذبات ہے اور کیا ہے
وہی انتظارِ مسلسل کا عالم — جنونِ ملاقات ہے اور کیا ہے
فغانِ شبی، نغمۂ صبحگاہی — فریبِ مناجات ہے، اور کیا ہے
یہ دوزخ یہ جنّت یہ امر و نواہی — فسونِ روایات ہے، اور کیا ہے
نظر ڈال اضداد کی حکمتوں پر — ہر اک نفی اثبات ہے، اور کیا ہے
نہ پوچھو مرے ذوقِ عصیاں کا حاصل — جوانی کی اک رات ہے، اور کیا ہے
کہاں ہم، کہاں تم، کہاں یہ ستارے — یہ دل کی کرامات ہے، اور کیا ہے

ترے من کی دنیا ہے مرے من کی دنیا
فریبِ طلسمات ہے اور کیا ہے

مری اشک ریزی پہ اتنی نہ کانپو
کہ یہ عیشِ جذبات ہے اور کیا ہے

ہے ساغرؔ کو مٹنے کی خواہش ابھی تک
یہ سحرِ خرابات ہے اور کیا ہے

کیوں تم کو لطفِ شام و سحر میں نہیں رہا
کیا میرا اعتبار نظر میں نہیں رہا

ساکت ہے کائنات تو جامد ہیں شش جہات
جیسے کہ دورِ شمس و قمر میں نہیں رہا

جس میں فروغِ لالہ و گل دیکھتا تھا مُنہ
وہ آئینہ حریمِ سحر میں نہیں رہا

آئینہ ہی نہیں ہے تحیّر سے چور چور
جوہر مزاجِ آئینہ گر میں نہیں رہا

ہر شے کو دیکھتا ہوں مگر دیکھتا نہیں
احساسِ دیدِ چشم و نظر میں نہیں رہا

دل اختیار میں ہے نہ قابو ہے روح پہ
میرا وجود میرے اثر میں نہیں رہا

تھی گردشِ حیات بھی جس عزم سے خجل
وہ عزم میرے ذوقِ سفر میں نہیں رہا

جو چومتا تھا اُڑ کے تخیّل کی چوٹیاں
وہ اشتیاق بازو و پر میں نہیں رہا

جو میرے آشیاں کو بناتا تھا آشیاں
وہ اضطراب برق و شرر میں نہیں رہا

کشتی مری امید کی اب کون لے چلے
طوفان کوئی دیدۂ تر میں نہیں رہا

جس نے تجھے تراش کے معبود کر دیا
وہ بت تراشِ قلب و نظر میں نہیں رہا

جس میکدہ کا مست خرامی تھا ایک نام
وہ میکدہ بھی راہگزر میں نہیں رہا

آتا تھا جس سے تیرِ خرامِ حسیں میں لوچ
اب وہ ہجوم راہگزر میں نہیں رہا

ملتا ہوں ہاتھ آہ کہ جب لگ رہی تھی آگ
کیوں اُس گھڑی میں بھی دل کے گھر میں نہیں رہا

ہر دم نوازشیں ہیں نہ پیہم ستائشیں
اب کوئی لطف عرضِ ہنر میں نہیں رہا

عکّاس تھا جو تیرے جمال و جلال کا
وہ سوزِ حسن شام و سحر میں نہیں رہا

مُبہم سا اک فریبِ اجابت تھا جس کا نام
وہ ربط بھی دعا و اثر میں نہیں رہا

پرتو سے جس کے آرزوئے دل جوان تھی
وہ التفات تیری نظر میں نہیں رہا

شاید یہ کائنات بکھرتی نہ کچھ دنوں
کچھ اور کیوں ہیں تیری نظر میں نہیں رہا

اُلٹے سیدھے شکووں پر، وہ کافر حیراں کیا ہوگا!
عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے، حسن پشیماں کیا ہوگا!
ہوگا کیا جینے کا سہارا، زیست کا ساماں کیا ہوگا!
لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غمِ پنہاں کیا ہوگا
آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کارِ نمایاں کیا ہوگا!
اے غمِ پنہاں، اے غمِ پنہاں، اے غمِ پنہاں کیا ہوگا!!!

غرق ہوئے تو ہو جائینگے، کارِ نمایاں کیا ہوگا؟
موج کے اُٹھنے گرنے سے نقصانِ طوفاں کیا ہوگا!

طوفاں طوفاں بہتے پھرنا، رسوائی ہے کشتی کی
بچ نکلے تو دُنیا کو اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

کشتی نذرِ موجِ بلا ہے، موجِ بلا کا کیا کہنا
ساحل تک پہنچا بھی دیا تو ہم پر احساں کیا ہوگا

لب ہیں جنباں شکوے لرزاں گویائی کی تاب نہیں
شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوخ پشیماں کیا ہوگا

کعبۂ دل آثارِ شکستہ اُن کی نگاہیں کفرِ تمام
شیخ و برہمن کچھ تو کہو، انجامِ ایماں کیا ہوگا

قیدِ حیات و جبرِ مشیّت اُس پہ فریبِ مختاری!
تجھ سے بڑھ کر اے غمِ ہستی کوئی زنداں کیا ہوگا

ان کا قصّہ بھید نہیں کچھ دل کا فسانہ راز نہیں
میرے دو اک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہوگا

موسمِ گُل میں ٹکڑے ہونا اور ہوا میں اُڑ جانا
اس سے زیادہ اے غمِ وحشت مصرفِ داماں کیا ہوگا
کوئل ہو یا بلبل ہو یا جھرنے ہوں کہساروں کے
کوئی بھلا ساغر کی طرح مستی میں غزل خواں کیا ہوگا

غرقابی تقدیر ہے جب، پھر دل کو ہراساں کون کرے
کشتی کشتی کون پکارے، طوفاں طوفاں کون کرے
وحشت میں اک وقفے کے اسرار نمایاں کون کرے
داماں ٹکڑے ٹکڑے کرکے، داماں داماں کون کرے
مشکل مشکل سب کہتے ہیں، جیسے اُن کی مشکل ہو!
دیکھیں ان تن آسانوں میں مشکل آساں کون کرے
نازک دل ہیں نازک فطرت، سہہ نہ سکیں گے نالوں کو
بس بھی کر اے جذبۂ بیجا! ان کو پریشاں کون کرے
چار گرہ کپڑے کی خاطر، سرِّ وحشت کیوں کھولیں
چاک ہوا سو چاک ہوا، اب ذکرِ گریباں کون کرے

پہلے زباں کہتی ہے اُن سے دل کی بپتا بانظریں
دیکھیں اُن کی محفل میں یہ کارِ نمایاں کون کرے

جان سی پڑ جائیگی ابھی ان مُردہ مُردہ پھولوں میں
صبح سویرے نکہتِ گل پر ان کو خراماں کون کرے

آس نہ تھی تو یاس ہی سے کچھ رونق تھی کاشانے کی
راکھ ہوئی یہ چنگاری بھی دل کو فروزاں کون کرے

عصیاں میری فطرت ہے اور عصیاں ہی میراث مری
ذوقِ گنہ پر نادم ہوکر خود کو پشیماں کون کرے

رازِ باطل فاش کیا خاصانِ حق نے خوب کیا
حق بھی ابتک مُبہم ہے اس راز کو عریاں کون کرے

لے گیا کوئی چھین کے وہ شے جس سے تن من گاتے تھے
تو ہی بتا اے تلخیٔ غم ساغرؔ کو غزل خواں کون کرے

دل سے بھی غمِ عشق کا چرچا نہیں کرتے
ہم ان کو خیالوں میں بھی رسوا نہیں کرتے

آنسو کو گہر، بوند کو دریا نہیں کرتے
طوفانِ غمِ دوست کو رسوا نہیں کرتے

ہم ان سے ستم کا بھی تقاضا نہیں کرتے
احساسِ کرم حُسن میں پیدا نہیں کرتے

آنکھوں سے بھی ہم عرضِ تمنّا نہیں کرتے
خاموش تقاضا بھی گوارا نہیں کرتے

میں کانپ اٹھا کیف سے اے پیکرِ نازش
اس تشنگیٔ شوق سے دیکھا نہیں کرتے

اللہ رے اندیشۂ انجامِ تمنّا
ہم اُن کے تقاضوں کی بھی پروا نہیں کرتے

منظور سہی از سرِ نو دل کی تباہی
پھر بزم میں یوں ہاتھ دبایا نہیں کرتے

سجدہ بھی ہے منجملۂ اسبابِ نمائش
جو خود سے گزر جاتے ہیں سجدا نہیں کرتے

جن کو ہے تری ذات سے یک گونہ تعلّق
وہ تیرے تغافل کی بھی پروا نہیں کرتے